قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

تدوینِ قرآن

افادات:

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ

مقدمہ: حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی رحمہ اللہ

استاذ مشرف تخصص فی الحدیث

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

تدوین قرآن

افادات:

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۃ البخاری

نام کتاب: تدوین قرآن

افادات: مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

۱۴۲۶
2005

مکتبۃ البخاری
نزد صابری پارک ○ گلستان کالونی ○ کراچی

حرفِ آغاز

ألحمدللہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

أمابعد:

علماء امت نے عظیم الشان دین کی خدمات انجام دیں ہیں آخری دور میں حق تعالیٰ نے علماء دیوبند کو اپنے دین کی خدمت کی خاص توفیق دی ہے مثالیں اسکی متقدمین ہی کے زمانے میں مل سکتی ہیں۔ انہی متقدمین ہی میں سے ''علامہ سیّد مناظر اُحسن گیلانی'' رحمہ اللہ بھی علماء دیوبند کے اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے قرآن وحدیث کی بے مثال خدمات، درس وتدریس اور وعظ وارشاد، تحریر وتقریر کی شکل میں انجام دی ہیں اسی طرح مولانا مناظر اُحسن گیلانیؒ کے علوم وافکار اُن کے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اہل نظر کے لئے انکا یہ ہی سرمایہ علم وفن ایک کارآمد ذریعہ تعارف کی حیثیت رکھتا ہے۔

جنکی شخصیت پر مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کا کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے کیونکہ شاید ہی کوئی ایسا علمی وادبی حلقہ ہو جس میں آپ کی تدریسی مہارت کی شہرت اور تقریر وتحریر کا ذوق وکمال کا چرچا نہ پہنچا ہو، بلا مبالغہ آپ ایک کثیر المطالعہ شخصیت تھے۔

مولانا کے علم وفضل کے زمانہ شباب میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، امام غزالی، اورامام رازی وشاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کی وسعت معلومات اورتبحر علمی کی یادتازہ کردی ہے،اس میں مولانا کے بہت سے مضامین ومقالات کے علاوہ سب سے پہلی کتاب ''ابوذر غفاریؓ'' جوکہ دیوبند سے شائع ہوکرمقبول عوام وخواص بنی، مولانا کی اس پہلی کتاب کودیکھ کرجوطالب علمانہ دورکی یادگارہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہ پیشن گوئی فرمائی تھی کہ اس کتاب کا مؤلف آئندہ چل کرمحقق ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا قرآنی، حدیثی، فقہی، سیاسی، معاشی علوم میں مولانا نے تحقیق کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ خود انکے اُستاذ عالی مقام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ بھی ان کے کمال کے معترف تھے، اسکے علاوہ آپکی دیگر مشہور ومقبول ترین تصنیفات: ''نظام تعلیم وتربیت''، ''الدین القیم''، ''النبی الخاتم''، ''تدوینِ حدیث'' اور ''تدوین قرآن''، ''تدوین فقہ'' کے علاوہ بہت سے مسودات اب بھی مولانا کے خاندان میں محفوظ ہیں، جن کی طباعت واشاعت امت کی موجودہ دور کے اہل علم سے بطورخاص مطالبہ عمل کرتی ہے۔

مولانا کا جوسرمایہ علم وفضل کتابوں اوررسالوں میں چھپ کر باہر آچکا ہے یقین مانیئے مقدار میں اس سے بہت زیادہ اورمعیار میں اس سے بلندتر ذخیرہ ابھی مسودات ہی کی شکل میں محفوظ ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات کومعلوم ہے کہ مولانا کی کوئی کتاب بھی باضابطہ تصنیفی پروگرام کے ماتحت انجام نہیں پائی یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مصلحت کی فرمائش کی، مولانا لکھنے بیٹھ گئے جب لکھ چکے تو وہ مضمون، مضمون نہ رہا بلکہ کتاب بن گئی، چنانچہ کئی کتابیں مولانا کی اسی قبیل کی تصنیفات ہیں اس ضمن میں آپکے شاگرد خاص ''مولانا غلام محمد صاحب

(ایم۔اے۔عثمانیہ) مقالات احسانی کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں: ''کہ مولانا کی کوئی تحریر کامل طورپرمرتب ومربوط نہیں ملتی، علوم کا ورود اس قدرزیادہ ہوتا تھا کہ متعلق اورغیرمتعلق کا انتخاب ان کے لئے محال ہوجاتا تھا وہ تیزی سے قلمرائی فرماتے تھے، اورقلم روکنے سے پہلے ان کوخود بھی اندازہ نہ ہوتا تھا کہ جوکچھ لکھا جارہا ہے وہ مضمون ہوجائے گا یا کتاب بن جائے گی اوران کے مسودوں کی ترتیب وتدوین انکے معتمد علیہ شاگردوں اورعقیدت مندوں کے سپردہوتی تھی۔

اب زیرِنظر کتاب کی طرف آیئے! تدوینِ قرآن جوکہ مولانا کی یادگارتصنیف ہے جس میں آپ نے جامع القرآن کے متعلق عوام الناس کے یہاں جوغلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس غلط فہمی کا ازالہ کے لئے آپ نے نہایت خوش فہم انداز سے اسکی حقیقت بتلائی اور اس کا سدِّ باب پیش کیا۔

اس کے علاوہ قرآن کی کتابت کس طرح ہوئی اوراسکی ابتدائی حالت کیا تھی۔؟ اورقرآن کریم ابتداء میں کس چیزپرلکھا گیااورلکھنے والے کون تھے۔؟ چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خود اُمّی تھے۔ ان جیسے دیگر مضامین پر مولانا موصوف رحمہ اللہ نے ایک نہایت ہی آسان انداز میں یہ کتاب ''تدوین قرآن'' تحریرفرمائی۔ اوراسی کتاب کا جوہری خلاصہ آپکے شاگرد رشید مولانا غلام محمد ربانی صاحبؒ نے نکال کرہمارے سامنے رکھا تاکہ ہم اس کو پڑھ کرآئندہ آنے والے فتنوں کا سدِّ باب کرسکیں۔

''تدوین قرآن'' پہلی مرتبہ ندوۃ المصنفین دھلی سے چھپی تھی، دوسری بار مکتبہ اسحاقیہ جونامارکیٹ کراچی سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہمارے پیشِ نظریہی آخری طبع ہے، طبع مذکورہ (۱۱۲) صفحات پرچھوٹی تقطیع کے ساتھ شائع کی گئی تھی۔

عرصہ دراز سے یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہ تھی، ضرورت تھی کہ اسے سہ بارہ شائع کیا جائے، طبع دوم میں بہت اغلاط تھیں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ طبعِ اوّل میں کچھ اغلاط رہ گئی تھیں۔ عبارتوں میں قطع و برید، مراجع کے جلد نمبر، اور صفحہ نمبر غلط، آیتوں کے حوالے میں بھی غلطیاں ہوئی تھیں، کہیں کتاب کا حوالہ رہ گیا ہے، اس طبع میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے۔

(۱) تمام آیات کے ساتھ سورت کا نام اور آیت نمبر درج کیا گیا ہے۔

(۲) تمام احادیث کو اصل مرجع وماٴخذ میں تلاش کیا گیا اور ان کی تصحیح کی گئی اور کتابوں کا حوالہ بھی درست کیا گیا ہے اور جہاں تخریج کی ضرورت پیش آئی تو حاشیہ میں اسکی تخریج بھی کی گئی ہے۔

(۳) اس کے علاوہ جن کتابوں سے حضرت مصنفؒ نے عبارتیں پیش کی ہیں ان کو اصل مرجع میں تلاش کیا گیا اور ان کی تصحیح کی گئی۔

(۴) کتابوں کی طبعات مختلف ہوتی ہیں ایک ہی طبع کے مطابق جلد نمبر اور صفحہ نمبر لگائے گئے ہیں۔

(۵) اور طبع کی تعیین کے لئے کتاب کے آخر میں مراجع ومصادر کی فہرست پیش کی گئی ہے، جس میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، سن وفات، طبع اور سنِ طباعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

''تدوین قرآن'' کے مقدمے کے لئے حضرت استاذ محترم مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی استاذِ محترم نے اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت نکال کر مقدمہ لکھا اور اغلاط کی نشاندہی فرمائی لیکن استاذ محترم نے ''مکانۃ

الامام محمد بن الحسن الشیبانی فی الحدیث'' اور ''**تاریخ التفقیہ والفقہ فی الاسلام**'' کی تکمیل میں مصروفیت کی بناء پر تصحیح سے معذرت فرمائی اور یہ کام مولوی محمد اسداللہ تخصص فی الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے سپرد فرمایا اور انہوں نے حسبِ ارشاد تصحیح وتخریج فرمائی۔

آخر میں اپنے اساتذہ کرام ''مولانا محمد انور بدخشانی صاحب دامت برکاتہم'' اور ''مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب'' جنہوں نے اپنی مصروفیات اور مشاغل کے باوجود تقریظ اور تفصیلی مقدمہ تحریر فرمایا (یہ ان کی محبت ہے) میں ان کا شکر گذار ہوں، اور مولوی اسداللہ صاحب کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت کو اس کام کے سپرد کیا اور علمی جواہر کا انتخاب کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ان اساتذہ کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے۔ (آمین)

محمد امین

عرضِ ناشر

ایک مسلمان کیلئے اہم ترین ہستی کون ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ایک ہی ہوسکتا ہے، یعنی اس سلسلے میں دو رائے کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ یہ بات طے ہے کہ ایک مسلمان کیلئے اہم ترین ہستی اللہ تعالیٰ کی ہے جو خالق ہے، مالک ہے، پالنہار ہے، اور اسکے عارفین کہہ گئے: "لا مطلوب الا اللہ، لا مقصود الا اللہ" یعنی اللہ کے علاوہ ہمارا کوئی مطلوب ہے نا مقصود ہے۔ تو چونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اہم ترین ہستی ہے اس لئے اُس کا پیغام اور اس پیغام کو لانے والے پیغمبر بھی ہمارے لئے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام "قرآن" کے روپ میں ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ جو دنیا وآخرت میں ہماری کامیابی، کامرانی اور سرفرازی کا ذریعہ ہے بشرطیکہ ہم اسکے حقوق ادا کریں۔

زیرِ نظر کتاب "تدوین قرآن" پڑھنے سے پہلے تو میں یہی سمجھتا تھا کہ قرآن کے ہم پر پانچ (۵) یا زیادہ سے زیادہ چھ (۶) حق ہیں، مگر یہ کتاب دیکھنے کے بعد میں یہ سمجھتا ہوں کہ بات اس سے ذرا آگے ہے۔ لیکن اگلی بات کرنے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بات یعنی قرآن کے بنیادی پانچ، چھ حقوق بیان کردیئے جائیں اور وہ مشہور و معروف

حقوق یہ ہیں کہ:

۱۔ قرآن پر ایمان لانا، اس کی بات پر صدقِ دل سے یقین کرنا۔
۲۔ قرآن کی تلاوت کرنا، مطالعہ کرنا۔
۳۔ قرآن کو سمجھنا، اس کا فہم حاصل کرنا۔
۴۔ قرآن پر عمل کرنا، اپنی زندگیاں اس کے مطابق ڈھالنا۔
۵۔ اسکی تعلیمات دوسروں تک پہنچانا۔
۶۔ اجتماعی طور پر اسکا عملی نفاذ کرنا۔

یہ تو تھے قرآن کے وہ عمومی حقوق جو پہلے سے سنتے چلے آرہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی ادائیگی کی توفیق دے تاکہ ہم اچھی زندگی گذاریں اور مبارک موت پائیں اور مرنے کے بعد بھی خوشگوار زندگی ہماری منتظر ہو۔ (آمین)

اب آیئے اگلی بات کی طرف کہ یہ کتاب "تدوین قرآن" دیکھنے کے بعد یہ بات کھلی کہ قرآن کا دفاع اور قرآن کی حفاظت بھی ہمارا فرض ہے اور قرآن کا حق ہے۔ اگرچہ قرآن کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمّے لے رکھی ہے، لیکن اِسی قرآن میں اللہ نے ہمیں یہ فرمایا ہے کہ "ان تنصروا اللہ ینصرکم" یعنی اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بارہویں پارے کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "ومامن دآبّۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا" یعنی زمین پر چلنے والا ایک بھی سر (یعنی ذی نفس) نہیں جس کے رزق کی ذمّہ داری اللہ پر نہ ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہر ایک کے رزق کا ذمّہ دار ہے مگر دیکھیئے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی جانب جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ دریائے نیل کے کنارے اگر ایک کتا بھی بھوک کی وجہ

سے مرجائے تو مجھ سے اسکی پوچھ ہوگی۔

یعنی اللہ کا خلیفہ ہونے کی نسبت سے ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ جو کام اللہ نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں ان کی تکمیل کی کوشش حتی المقدور کریں۔ اور اللہ کا حقیقی خلیفہ فی الارض ہونے کا ثبوت دیں۔

یہی سوچ تھی جس کی وجہ سے یہ کتاب ''تدوین قرآن'' کو اپنے ادارے کے ذریعے شائع کرنے کا خیال زور پکڑ گیا، اور دل نے کہا کہ قرآن کی تدوین وترتیب میں ہمارے اکابرین نے اپنی عمریں کھپادیں اور بہترین صلاحیتیں اس اعلیٰ کام میں صرف کردیں۔ تو ہم ان کا تذکرہ ہی حتی المقدور عام کرنے میں معاون بن کر اپنی آخرت کا کچھ سامان کرلیں۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور پڑھنے والے قدردانِ علم کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عبدالواحد قادری
فقط خادم مکتبۃ البخاری
نزد صابری مسجد گلستان کالونی
کراچی

فہرست مضامین

تقریظ

از اُستاذِ حدیث مولانا محمد انور بدخشانی مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم جہاں ہماری دینی، ایمانی، مذہبی، علمی، دنیوی اور اخروی کتاب ہے، وہاں یہ پچھلی تمام آسمانی کتابوں کی مُصدّق، مؤید اور مہیمن بھی ہے، اس عظیم کتاب کی تدوین کا انتظام ایامِ نزول ہی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے کیا، چونکہ یہ آخری اور ابدی کتاب تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرمایا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (سورۂ حجر، آیت:۹)

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لیے مختلف طریقے بروکار لائے، ایک طرف صحابہ اور امت کے دیگر افراد اس قانون ہدایت واصول نجات بشری کو اپنے سینوں میں محفوظ کرنے لگے تو دوسری طرف پیغمبر کو حکم دیا کہ سورتوں اور آیتوں کو جمع کر کے کتابی وتحریری شکل میں ترتیب دیں، تدوین قرآن کی اسی اہمیت کے پیش نظر سب سے پہلی وحی (سورۂ اقرا) میں قرأت اور قلم کو ذکر کر کے اسی طرف اشارہ دیا کہ اس وحی (قرآن کریم) کی حفاظت کے لیے قرأت (پڑھنے) اور قلم (لکھنے) دونوں کی یکساں ضرورت ہے۔

پھر ان آیات پر ذرا غور فرمایئے:

۱-﴿تَنزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾ (سورۂ احقاف، آیت:۲)

۲-﴿وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ﴾ (سورۂ انعام، آیت:۵۵)

۳-﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيهِ﴾ (سورۂ بقرہ، آیت:۲)

۴-﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ﴾ (سورۂ کہف، آیت:۱)

یہ تمام آیات اس وقت نازل ہوئیں جبکہ قرآن کتابی شکل میں یکجا مرتب موجود نہ تھا، اس کا مطلب یہی تھا کہ اس وحی آسمانی کی بقا کے لیے کتابت اور تدوین ازبس ضروری ہے۔

اور اب ان آیات کو دیکھیے:

۱-﴿وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ﴾ (سورۂ طور، آیت:۱/۲)

۲-﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ﴾ (سورۂ قلم، آیت:)

۳-﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ (سورۂ قیامۃ، آیت:۱۷)

یہ تمام آیات اس طرف اشارہ دیتی ہیں کہ یہ آسمانی وحی جلد سے جلد جمع، تدوین، ترتیب اور کتابت کا جامہ زیب تن کرنے والی ہے، جیسا کہ ایک کتاب کے لیے لازم ہے، اور اس کی حفاظت اور بقا کی ضامن بھی یہی چیزیں ہیں، چنانچہ قرآن کریم کی تدوین وترتیب وکتابت تین مراحل میں پایۂ تکمیل تک پہنچی، عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں۔

بے لگام اور بے دین مستشرقین اور مؤرخین نے اس بدیہی موضوع کو مبہم، غیر واضح اور پیچیدہ بنا کر پیش کیا ہے، مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے تدوین

قرآن کے متعلق اس رسالے میں انتہائی عمدہ، مدلل اور موجز باتیں سپرد قلم کی ہیں، مولانا مرحوم کی یہ کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ تدوین قرآن سے متعلق آپ کے مختلف مضامین ہیں جنہیں آپ کے شاگرد رشید نے یکجا کرلیا تھا، اس موضوع پر ''تدوین حدیث'' کی طرح آپ نے مستقل کتاب بھی تحریر فرمائی تھی لیکن افسوس کہ وہ شائع نہ ہوسکی، اور اس رسالے کو اس مستقل کتاب کا ''جوہری خلاصہ'' کہہ کر شائع کروادیا گیا، یہ رسالہ صاحب رسالہ کی نظر میں کیسا ہے۔؟

''انشاء اللہ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو شاید بڑے سے بڑے کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا، اسی وقت اس چھوٹی موٹی مختصری کتاب کی وقعت وقیمت کے صحیح اندازے کا لوگوں کو موقع ملے گا اور وقت وقت پر وہ تریاق انہیں اوراق سے میسر آئے گا جو شاید اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا، تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر وتامل، تلاش وجستجو کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔''

درج بالا کلام مبالغہ نہیں حقیقت ہے، زیر نظر کتابچہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کا واقعی مصداق ہے، اس رسالے کی طباعت نہ صرف یہ کہ ایک علمی ضرورت ہے بلکہ ایک اہم دینی فریضہ بھی ہے۔

محمد انور بدخشانی

جامعہ علوم اسلامیہ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

۱۴۲۶/۳/۲۶ھ

مقدمہ

ازمولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم *

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا سیّد مناظر اَحسن گیلانیؒ (۱) (۱۸۹۲=۱۹۵۶) نے ''تدوین قرآن'' کے موضوع کے روایتی ذخیرے پر جوشکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں ان کو دور کرنے کے لئے اردو زبان میں ایک مبسوط وضخیم کتاب لکھی تھی جو ان کے کم وبیش تیس چالیس برس کے مطالعہ وغور وفکر کا حاصل تھا، چنانچہ موصوف کا بیان ہے:

''تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر وتأمل، تلاش وجستجو کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن کے جمع وترتیب کی متعلقہ روایتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کتنے فاحش اغلاط اور پیچ در پیچ ہمالیائی مغالطوں کے پہاڑوں کو کتنی آسانی کے ساتھ اُڑا دیا گیا ہے۔ شکوک وشبہات کے سارے بادل پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ناجائز نفع اٹھانے والوں کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔''(۲)

* استاذ مشرف قسم التخصص فی علوم الحدیث جامعۃ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

(۱) مولانا کے حالات اور ان کے کمالات اور تالیفات کے متعلق ''ہزار سال پہلے'' کے مقدمے میں ہم لکھ چکے ہیں۔

(۲) تدوین قرآن، ص:۳۴

کتاب چونکہ مبسوط وضخیم تھی ان کے شاگردِ رشید ورفیق مولوی غلام ربانی (ایم۔اے عثمانیہ) نے اسے پڑھا اور اس کا خلاصہ تیار کیا مولانا کو دکھایا، انہیں پسند آیا، چنانچہ مولانا گیلانیؒ نے جو اس پر پیش لفظ لکھا ہے اسمیں موصوف کی اس کامیاب کوشش کو سراہا ہے، اور ان کے استنباطِ نتائج، اسلوبِ اداء اور دل نشین تعبیر کی تعریف کی ہے اور اپنی ضخیم تالیف کا اسے ''جوھری خلاصہ'' قرار دیا اور پھر اپنی اصل تالیف کی اشاعت سے ہاتھ اٹھالیا، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

''حق تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خاکسار کے رفیق محترم مولوی غلام ربانی ایم اے (عثمانیہ) نے اس فقیر سراپا تقصیر کی جگر کاویوں اور دماغ سوزیوں کے ان نتائج کو بڑے پاکیزہ اسلوب اور دل نشین تعبیر میں اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے۔ اگر چہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری کتاب کے اس ''جوہری خلاصہ'' کے شائع ہو جانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ اس ضخیم ومبسوط کتاب کے اکثر جوہری حقائق، اصولی مشتملات اس مختصر کتاب میں محفوظ ہو گئے ہیں، حق تعالی مولوی غلام ربانی کی اس محنت کا صلہ دین اور دنیا میں عطا کرے۔''(۱)

موصوف کے مذکورہ بیان سے ہمارے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مولانا مناظر اَحسن گیلانیؒ اپنی تصانیف میں اِدھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں اور عنوان وموضوع کے پابند نہیں رہتے ہیں، ان کے علم کی وسعت وپہنائی اور قلم کی جولانی موضوع وعنوان کی پابندی کو گوارا نہیں کرتی۔

(۱) تدوین قرآن، ص:۳۴

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے ''تدوین قرآن ،ص:۳۹'' پر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ (المتوفی ۴۳ھ) کے متعلق حاشیہ میں مورّخ اسلام علامہ شمس الدین ذھبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) کی کتاب ''تذکرۃ الحفاظ'' کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے:

''اسی سے اندازہ کیجئے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، جو علماء بنی اسرائیل میں سے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انہوں نے عرض کیا کہ ''قرآن'' کے ساتھ ''تورات'' کی تلاوت بھی جاری رکھوں! آپ نے فرمایا ''اقرأ ہذا لیلۃ و ہذا لیلۃ'' (یعنی ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات۔) (تذکرۃ الحفاظ، ج:۱،ص:۲۶)

طبقات ابن سعد میں بھی ابوالجلد الجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات ختم کرنے کا عام دستور اپنے لئے انہوں نے مقرر کیا تھا اور ختم کے دن لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔

(ابن سعد، ج:۱/۷،ص:۱۶۱)

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی صحیح راہ نمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔(۱)

تدوین حدیث میں بھی مولانا گیلانیؒ نے ان دو واقعات کو نقل کر کے اس خیال کا اظہار فرمایا ہے اور اپنی اس تحقیق پر اصرار فرمایا ہے۔(۲)

اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے شاگرد غلام ربانی نے ذیلی سرخی ''قرآن گزشتہ آسمانی کتابوں کا آخری ایڈیشن ہے'' کے تحت جو عبارت لکھی ہے:

(۱) تدوین قرآن،ص:۳۹،۴۰

(۲) ملاحظہ ہو ''تدوین حدیث'' ص:۲۴۸،۲۴۹، اردو ایڈیشن، ص:۲۱۱، عربی ایڈیشن

''بقول حضرت الاستاذ ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانہ سے نکالیں تو چند لانے والوں کی وجہ سے کیا وہی ایک کتاب بھی چند ہو جائے گی۔ یقیناً کسی مصنف کی کتاب کے چند ایڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی یہ ایک کتاب نہیں بلکہ چند کتابیں بن گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ اپنی اسی نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی ساری آسمانی کتابوں کا اپنے آپ کو وہ آخری اور مکمل ترین ایڈیشن قرار دیتا ہے اور قوموں کے پاس اس کتاب کے جو پرانے مشتبہ اور مشکوک یا ناقص وغیر مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس جدید ترین اور کامل ایڈیشن سے مقابلہ کر کے قومیں اپنی موروثی کتابوں کی تصحیح کر لیں، یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے، ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباؤ اجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بے تعلق ہو کر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور دھرم کی کتاب کی حیثیت سے مانا جائے یقیناً نہ قرآن ہی کا یہ مطالبہ ہے اور نہ قرآن کے ماننے والوں کی طرف سے یہ دعوت دنیا کے سامنے کبھی پیش ہوئی۔''(۱)

یہ متن وحاشیہ دونوں محلِ نظر ہے۔

اسلئے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے نبی و رسل بھیجے گئے اور کتابیں اتاری گئی ہیں ان کی کتابیں اور شریعت بھی ایک محدود زمانے تک قابل عمل تھی اس لئے یکے بعد دیگرے کتابیں بھی اتاری جاتی رہیں اور نبی اور رسول بھی بھیجے جاتے رہے اور سابقہ

(۱) تدوین قرآن، ص:۳۹

کتابیں منسوخ ہوتیں رہیں، تا آنکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور آخری کتاب دیکر بھیجا گیا اور دین وشریعت کی تکمیل کردی گئی۔ قرآن نے کہا ہے:

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا." (۱)

ترجمہ: "(اور) آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔" (۲)

لہذا سابقہ شریعتیں اور کتاب سب قابل اعتبار نہیں رہیں اس لئے کہ ان کی حفاظت ان اقوام کی ذمہ داری تھی۔ قرآن نے کہا:

"اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ. يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ." (۳)

ترجمہ: "بیشک ہم ہی نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور مشائخ اور علماء بھی کیونکہ وہ کتابِ خدا کے نگہبان مقرر کئے گئے تھے اور اس پر گواہ تھے (یعنی حکم الٰہی کی یقین رکھتے تھے) تو تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا

(۱) سورۃ مائدہ:۳

(۲) ترجمہ فتح محمد جالندھریؒ

(۳) سورۃ مائدہ:۴۴

اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔" (۱)

سابقہ امتوں نے ان میں لفظی تحریف بھی کی اور معنی بھی بدلے، نہ وہ اپنی اصل زبان میں اور نہ اصل صورت میں محفوظ رہ سکیں، وہ سب ایک زمانے کے لئے اتاری گئی تھیں، قرآن آسمانی کتابوں میں آخری کتاب ہے جو آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی تھی آخری نبی تھے ان کی نبوت دائمی اور ان کا معجزہ قرآن بھی دائمی ہے اس کتاب کی موجودگی میں نہ کسی کتاب مروجہ ومتداول آسمانی کتاب کی تلاوت کی اجازت ہے نہ اس پر عمل کرنا جائز ہے نہ اس کے پڑھنے پر اجروثواب ملے گا نہ برکات ہوسکتی ہے تاہم تقابلی مطالعہ کی اجازت ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے جس روایت سے جواز کی گنجائش نکالی ہے وہ بھی درست نہیں، حافظ شمس الدین ذھبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) کی اصل عبارت یہ ہے:

"ابراهيم بن أبي يحيى أنا معاذ بن عبدالرحمن عن يوسف بن عبدالله بن سلام عن أبيه أنه جاء الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: انى قرأت القرآن والتوراة فقال: اقرأ هذا الليلة وهذا الليلة. فهذا ان صح ففيه الرخصة في تكرير التوراة وتدبرها." (۲)

ترجمہ: "ابراہیم بن ابی یحییٰ کا بیان ہے کہ ہم سے معاذ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا، انہوں نے یوسف بن عبداللہ بن سلام سے، انہوں نے اپنے والد عبداللہ بن سلامؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: کہ

(۱) ترجمہ فتح محمد جالندھریؒ (۲) تذکرۃ الحفاظ، ج:۱، ص:۲۷

میں نے قرآن اور تورات دونوں پڑھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات۔

علامہ ذھبیؒ فرماتے ہیں: کہ اگر یہ روایت درست ہے تو اسمیں تورات کو باری باری پڑھنے اور اسمیں غور وفکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

نیز علامہ شمس الدین ذھبیؒ "سیر أعلام النبلاء" میں مذکورہ روایت نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اسناده ضعيف فان صح، ففيه رخصة في التكرار على التوراة التي لم تبدل، فأما اليوم فلا رخصة في ذلك الجواز التبديل على جميع نسخ التوراة الموجودة، ونحن نعظّم التوراة التي أنزلها الله على موسى عليه السلام، ونؤمن بها، فأماهذه الصحف التي بأيدي هؤلاء الضّلال فماندري ماهي أصلاً ونقف، فلانعاملها بتعظيم ولاباهانة، بل نقول: آمنابالله وملائكته وكتبه ورسوله ويكفينا في ذلك الايمان المجمل. ولله الحمد."(۱)

ترجمہ: "اس روایت کی سند ضعیف ہے اگر صحیح بھی مان لی جائے تو اس سے وہ تورات مراد ہوگی جس میں تبدیلی وتحریف نہ ہوئی ہو، اور آج کل کی تورات تو اسمیں یہ رخصت نہیں ہے: کیونکہ موجودہ تورات کے تمام نسخوں میں تحریف کا امکان ہے، ہاں ہم اُس تورات کی تعظیم کرتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی ہے اور اسی پر ایمان لاتے ہیں اور آج کل جو صحیفے ان گمراہ لوگوں کے پاس ہیں ہمیں معلوم نہیں

(۱) سیر أعلام النبلاء، ج:۲، ص:۴۱۹، طبع موسسۃ الرسالۃ طبع سوم ۱۴۰۵ھ

کہ یہ اصل ہے یا نہیں اسی میں ہم توقف کرتے ہیں، نہ اسکی تعظیم کرتے ہیں اور نہ توہین، بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ ہم اللہ اور اللہ کے فرشتوں اور کتابوں اور رسول پر ایمان لاتے ہیں، اور اس بارے میں ہمارے لئے ایمان مجمل ہی کافی ہے، سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں۔"

نیز علامہ حافظ ذھبیؒ نے "سیر أعلام النبلاء" (۱) میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے حالات میں اس امر پر مزید روشنی ڈالی ہے، وہ ہدیہ ناظرین ہے:

"ولايشرع لأحد بعدنزول القرآن أن يقرأ التوراة ولاأن يحفظها لكونها مبدلة محرّفة منسوخة العمل، قداختلط فيها الحق بالباطل، فليجتنب. فأما النظر فيها للاعتبار وللرد على اليهود، فلابأس بذلك للرجل العالم قليلاً، والاعراض أولىٰ. فأما ماروى من أن النبي صلى الله عليه وسلم أذن لعبدالله أن يقوم بالقرآن ليلة وبالتوراة ليلة فكذب موضوع قبّح الله من افتراه وقيل: بل عبدالله هنا هو ابن سلام وقيل: اذنه في القيام بها أي يكرر على الماضي لاأن يقرأبها في تهجده."

ترجمہ: "قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد نہ کسی کے لئے تورات کا پڑھنا جائز ہے اور نہ اس کو حفظ کرنا کیونکہ اسمیں ردوبدل اور تحریف ہوئی ہے اور اس پر عمل منسوخ ہے اس میں حق وباطل خلط ملط ہے لہذا اس سے بچا جائے۔ ہاں تورات کا مطالعہ کرنا اس لئے تا کہ اس کے ذریعہ یہود کے ساتھ بحث ومناظرہ اور ان پر رد کرنا

(۱) سیر أعلام النبلاء، ج:۲، ص:۸۶/۸۷، طبع موسسۃ الرسالۃ طبع سوم ۱۴۰۵ھ

آسان ہوتو عالم کے لئے اس میں تھوڑی بہت گنجائش ہے اور بہتر یہ ہے کہ صرفِ نظر کرے۔ اور وہ روایت جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ کو ایک رات قرآن پڑھنے اور ایک رات تورات پڑھنے کی اجازت دی ہے تو وہ موضوع اور جھوٹ ہے۔ اللہ بُرا کرے جس نے اس کو گھڑا ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد عبداللہ بن سلام ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت غور وفکر (تقابلی مطالعہ) کرنے کی ہے نہ کہ تہجد میں اسکی تلاوت کرنے کی۔''

نیز علاّمہ حافظ نورالدین ہیثمیؒ (المتوفی ۸۰۷ھ) ''مجمع الزوائد'' میں مذکورہ روایت یوں نقل کرتے ہیں:

''عن عبدالله بن سلام قال: قلت: يارسول الله قد قرأت القرآن والتوراة والانجيل. قال: اقرأ بهذا ليلة وهذا ليلة.''

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے قرآن اور تورات اور انجیل پڑھی ہیں۔ آپ نے فرمایا: کہ ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات وانجیل۔''

اسکے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''رواه الطبراني في الكبير وفيه من لم أعرفه عتاب بن ابراهيم وغيره.'' (۱)

ترجمہ: ''اس روایت کو طبرانی نے معجم کبیر میں نقل کیا ہے اور اسمیں عتاب بن ابراہیم وغیرہ راویوں کو میں نہیں جانتا۔ (یعنی مجہول ہیں)

(۱) مجمع الزوائد،۲/۲۷۰

مذکورہ بالا روایت متصل سند کے ساتھ علامہ حافظ ابونعیم اَصفہانیؒ (المتوفی ۴۳۰ھ) نے کتاب ''ذکر اَخبار اَصبہان'' (۱) میں اپنی حسبِ ذیل سند سے نقل کی ہے:

''حدثنا أبي ثنا محمد بن أحمد بن يزيد ثنا أحمد بن محمد بن الحسين، حدثني جدّي الحسين بن حفص ثنا ابراهيم بن محمد بن أبي يحييٰ المدني ثنا معاذ بن عبدالرحمن عن يوسف بن عبدالله بن سلام عن أبيه أنه جاء الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: اني قرأت القرآن والتورة فقال: اقرأ بهذه ليلة وبهذا ليلة.''

ترجمہ: ''ابونعیم کا بیان ہے کہ ہم سے میرے والد عبداللہ بن اَحمد نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن اَحمد بن یزید نے بیان کیا ان سے احمد بن محمد بن الحسین نے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے دادا حسین بن حفص نے بیان کیا، ان سے معاذ بن عبدالرحمٰن نے، انہوں نے یوسف بن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما سے، انہوں نے اپنے والد عبداللہ بن سلام سے......الخ

علامہ ابن عساکرؒ نے بھی اس واقعہ کو'' تاریخ دمشق'' میں ابونعیم کی سند سے ذکر کیا ہے۔ (۲)

۱) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظ ذھبیؒ کو اس روایت کی صحت میں ہی شک ہے۔

(۱) ج:۱،ص:۸۴،مطبوعہ بریل لیڈن ۱۹۳۱ء

(۲) ملاحظہ ہو: تہذیب تاریخ دمشق الکبیر، ج:۷،ص:۴۵۰، طبع داراحیاء التراث العربی طبع سوم ۱۴۰۷ھ

۲) پھراس کا راوی ''ابراہیم بن أبي یحییٰ'' معتبر اور ثقہ نہیں، جھوٹا اور کذاب ہے۔(۲)

۳) نیز یہ اُس صحیح حدیث کے خلاف ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات دیکھ کر ناراضگی کا اظہار فرمایا تھا۔ وہ روایت یہ ہے:

''وعن جابر أن عمر بن الخطاب رضی الله عنهما، أتى رسول الله صلى الله عليه وسلم بنسخة من التوراة، فقال: يارسول الله! هذه نسخة من التوراة، فسكت فجعل يقرأ ووجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتغير فقال أبوبكر: ثكلتك الثواكل! ماترى مابوجه رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ فنظر عمر الى وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: أعوذ بالله من غضب الله وغضب رسوله رضينا بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: والذى نفس محمد بيده لو بدا لكم موسىٰ فاتبعتموه وتركتمونى لضللتم عن سواء السبيل، ولو كان حيا وأدرك نبوتى لاتبعنى.'' (۲)

---

(۱) مزید ملاحظہ فرمائیں: تقریب التهذیب، ج:۱، ص:۵۷ مع تعلیق محقق خلیل مأمون شیخا طبع دارالمعرفۃ بیروت للبنان، طبع ۱۴۲۲ھ

(۲) رواه الدارمی، مشکوۃ بشرح المرقات لملاعلی القاریؒ، ج:۱ص:۴۳۹، طبع حقانیہ ملتان، فتح المنان شرح کتاب الدارمی، ج:۳، ص:۱۹۱، طبع دارالبشائر بیروت طبع اول ۱۴۱۹ھ

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کا ایک نسخہ لیکر آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ تورات کا نسخہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پڑھنا شروع کیا اور (غصہ کی وجہ سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عمر تمہارا ناس ہو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر غصہ کے آثار تمہیں دکھائی نہیں دیتے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کی طرف دیکھا اور کہا: میں اللہ اور اسکے رسول کے غصہ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ ہم اللہ کو رب ماننے پر اور اسلام کو دین تسلیم کرنے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے پر راضی وخوش ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور تم ان کی اتباع کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے، اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو میری اتباع کرتے۔''

مذکورہ بالا حدیث سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ (تقابلی مطالعہ کے علاوہ) ان کتابوں کا پڑھنا درست ہی نہیں اسلئے کہ یہ سب اب منسوخ ہیں، اسلئے کہ ناسخ کی موجودگی میں منسوخ کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔

مناظر اُحسن گیلانیؒ حضرت عمرؓ کے مذکورہ قصہ کے بارے میں تدوین حدیث میں فرماتے ہیں:

''باقی طبرانی وغیرہ کے حوالہ سے حضرت عمرؓ کے متعلق جو یہ روایت منسوب کی گئی

ہے کہ وہ تورات کا ایک مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے اور عرض کرنے لگے کہ بنی زریق میں مجھے اپنے ایک بھائی سے یہ مجموعہ ملا ہے، کہتے ہیں کہ اس حال کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غضبناک ہوگیا، حضرت عمرؓ کو جب اس کا احساس ہوا تو معافی مانگنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ رہتے تو بجز میری پیروی کے ان کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔''

جمع الفوائد میں اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ''ابوعامر قاسم بن محمد الاسدی'' ایک شخص ہے دراصل یہ مجہول راوی ہے اس لئے روایت خود بھی مشتبہ ہے نیز یہ ممکن ہے کہ اس یہودی کو بھائی قرار دینے پر عتاب کیا گیا ہو، نیز اور بھی اسباب اس کے ہوسکتے ہیں۔ بہرحال یہ جانتے ہوئے کہ تورات کا نسخہ بہت کچھ محرّف ہوچکا ہے پھر قرآن پڑھنے والے کو اسی محرّف تورات کی تلاوت کی جو اجازت دی گئی تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ محرف تورات کا مصحح تو اسکے پاس موجود ہی تھا یعنی قرآن اور قرآن کو مصحح بنا کر جو بھی تورات پڑھے گا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ گمراہی میں مبتلا ہو بلکہ کچھ فائدہ ہی حاصل کرے گا۔''

(تدوین حدیث، ص:۲۴۹، اردو ایڈیشن، مکتبہ اسحاقیہ کراچی)

تو مولانا گیلانی کا یہ کہنا کہ ''اسکی سند میں ''ابوعامر قاسم بن محمد الاسدی'' ایک شخص ہے دراصل یہ مجہول راوی ہے اس لئے روایت خود بھی مشتبہ ہے'' یہ حقیقت پرمبنی ہے لیکن مولانا نے اس پہلو پر غور نہیں فرمایا کہ حدیث کے اور بھی طُرق ہوسکتے ہیں۔

چنانچہ طبرانی کی سند میں مجہول راوی ہے لیکن دارمی کی روایت جو ہم نے نقل کی ہے اس میں کوئی راوی مجہول نہیں۔ دارمی کی سند ملاحظہ ہو:

''أخبرنا محمد بن العلاء، ثنا ابن نمير عن مجالد، عن

عامر، عن جابر أن عمر بن الخطابؓ ...... الخ''

فتح المنان شرح دارمی میں اس سند کے بارے میں لکھتے ہیں:

''واسناد الأثر على شرط الصحيح غير مجالد وقد أخرج له مسلم في المتابعات والشواهد فالحديث صحيح لغيره، ومما يدل على قوة اسناده صنيع الامام البخاري رحمه الله، حيث بوّب له في الاعتصام من الصحيح. فقال: باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: لاتسألوا أهل الكتاب عن شئ.''

قال الحافظ: هذه الترجمة لفظ حديث أخرجه أحمد والبزار من حديث جابر...... وذكره ثم قال: ورجاله موثقون الا أن مجالد ضعيفا، واستعمله في الترجمة لورود مايشهد بصحته من الحديث الصحيح.

ترجمہ: ''اس حدیث کی سند صحیح کے درجے کی ہے مجالد کے علاوہ (اسکے تمام راوی صحیحین کے ہیں)، امام مسلمؒ نے مجالد کی حدیث متابعات اور شواہد میں ذکر کی ہے اس بناء پر یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں کتاب الاعتصام میں جو باب باندھا ہے ''**باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لاتسألوا أهل الكتاب عن شئ**'' امام بخاری کے اس طرزِ بیان سے بھی اس حدیث کی سند کو تقویت ملتی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس باب کے تحت شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ اس حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو بزار اور امام أحمد نے روایت کیا ہے'' اور حضرت جابرؓ کی پوری حدیث ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں'' کہ اس سند کے

راوی تمام ثقہ ہیں سوائے مجالد کے کہ وہ ضعیف ہے، اور امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں اس وجہ سے لائے ہیں کہ اس حدیث کے اور شواہد بھی ہیں جس کی وجہ سے یہ حدیث صحیح کے درجے کو پہنچ گئی ہے۔"

اس کے بعد صاحب فتح المنان نے مسند أحمد، مسند بزار، مصنف بن أبي شيبة، جامع بيان العلم والفضل، مسند أبي يعلى موصلي، مصنف عبدالرزاق، فضائل القرآن لابن الفريس، شعب الايمان، جامع لأخلاق الراوي وآداب السامع سے اس تائید میں تین (۳) احادیث بطور شواہد نقل کی ہے۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فتح المنان، ج:۳،ص:۱۹۱تا۱۹۴)

مذکورہ بالا دونوں حدیثیں خبر آحاد ہیں، دونوں میں تعارض ہے پہلی حدیث سند کے اعتبار سے متکلم فیہ ہے جس کے راوی پر جرح ہے۔ اور دوسری سند اور متن کے اعتبار سے درست ہے اس لئے وہی قابلِ ترجیح اور قابلِ عمل ہے۔

مولانا گیلانیؒ نے توریت کی تلاوت کی تائید میں ایک حسبِ ذیل واقعہ یہ نقل کیا ہے جو ہدیہ ناظرین ہے:

"قال: أخبرنا سليمان بن حرب قال: حدثنا حمادبن زيد عن ميمونة بنت أبي الجلد قالت: كان أبي يقرأ القرآن في كل سبعة أيام ويختم التوراة في ستة يقرؤها نظراً فاذا كان يوم يختمها حشد لذلك ناس، وكان يقول: كان يقال: تنزل عند ختمها الرحمة."(۱)

(۱) طبقات ابن سعد، ج:۷،ص:۲۲۲،طبع دار الفکر بیروت (۲) تدوین قرآن،ص:۴۰

ترجمہ: "سلیمان بن حرب بیان کرتے ہیں کہ ہم سے حماد بن زید نے بیان کیا، انہوں نے میمونہ بنت ابی الجلد سے نقل کیا ہے وہ فرماتی ہیں کہ میرے والد ابوالجلد سات دن میں قرآن ختم کرتے اور چھ دن میں تورات کو دیکھ کر ختم کرتے، جب ختم والا دن ہوتا تو کچھ لوگ ختم کے لئے جمع ہوجاتے، اور ابوالجلد فرماتے تھے کہ کہا جاتا تھا کہ ختم کے دوران رحمت اُترتی تھی۔"

۱) تو یہ کسی صحابی اور فقیہ کا عمل نہیں۔

۲) اور یہ ان کا انفرادی عمل ہے۔

۳) اس میں چند عام آدمی آجاتے تھے اسمیں کسی بڑے عالم اور فقیہ کی شرکت ثابت نہیں۔

۴) یہ ان کی اپنی رائے اور اپنا خیال ہے۔

۵) نہ اس کا کوئی چرچا تھا۔

مولانا گیلانیؒ نے اپنے جس تجربہ کا ذکر کیا ہے کہ "اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔"(۲) تو یہ تقابلی مطالعہ کی بات ہے اس کا کوئی منکر نہیں ورنہ یہ کہ اس کی تلاوت کی جائے اور اس سے رحمت اترتی ہے اس کا کوئی قائل نہیں۔

یہ تدوین قرآن کا "جوہری خلاصہ" مولانا گیلانیؒ کی تصنیف نہیں اس لئے اس میں مولانا کی زبان کا لطف نہیں ہے۔

مولانا گیلانیؒ کی بعض دوسری آراء بھی ہیں جس سے محققین کو اتفاق نہیں۔ جیسے کہ تدوین الحدیث ص:۱۹۱ بزبان عربی از ڈاکٹر مولانا عبدالرزاق اسکندر صاحب، تخریج

ومراجعت ڈاکٹر بشار عوّاد معروف۔

''تدوین قرآن'' کا یہ ''جوہری خلاصہ'' جو پاکستان کراچی میں آج سے ۱۹ سال قبل شائع ہوا تھا مولوی محمد امین بن صابر حسین (اللہ انہیں خوش رکھے) اسے از سرِ نو شائع کر رہے ہیں۔ ان کی یہ سعی لائق تحسین اور قابل مبارک باد ہے۔ اُمید ہے کہ طلبہ اور اہلِ ذوق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

محمد عبدالحلیم چشتی

۱۴۲۶/۵/۲۰ھ

=۲۰۰۵/۶/۲۸ء

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفی والصلوۃ والسلام علی عبادہ

الذین اصطفی

امابعد: وقت پڑنے سے پہلے بعض کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا، لیکن ضرورت جب پیش آجاتی ہے تو دنیا بڑی بے کسی کے ساتھ اس وقت اُن کتابوں کو ڈھونڈتی ہے۔

تقریباً کچھ یہی حال اس ''کتابچہ'' یا ''مقالہ'' کا بھی ہے، پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس حال میں بنی نوعِ انسان کے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے، من وعن ہو بہو سر مو تفاوت کے بغیر یہ ''خدائی صحیفہ'' آج بھی دنیا میں موجود ہے خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں ہی کا یہ مسلمہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ غیر اسلامی دائروں کی بھی یہ ایک جانی پہچانی مانی ہوئی بات ہے اسی لیے قرآنی آیات وسور کے جمع وترتیب کی سرگزشت کی تلاش کی عام طور پر ضرورت سمجھی نہیں جاتی مگر خدانخواستہ بداندیشی سے کام لینے کی بدبختانہ جرأت اگر کبھی کی گئی تو مسلمانوں ہی

کی کتابوں میں بعض ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن سے بداندیشی کی اس مہم میں شاید ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے عوام کو مغالطوں کا شکار بنایا جا سکتا ہے۔

دل تو یہی چاہتا ہے کہ بداندیشی کا یہ جذبہ کبھی نہ اُبھرے لیکن شیطان نے اس سوال کو اگر چھیڑ دیا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا جو شاید بڑے سے بڑے کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا، اُسی وقت اس چھوٹی موٹی مختصری کتاب کی وقعت و قیمت کے صحیح اندازہ کا لوگوں کو موقع ملے گا اور وقت پر وہ تریاق انہی اوراق سے میسر آئے گا جو شاید اس کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر و تامل، تلاش و جستجو کے آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔ جن لوگوں نے قرآن کے جمع و ترتیب کی متعلقہ روایتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کتنے فاحش اغلاط اور پیچ در پیچ ہمالیائی مغالطوں کے پہاڑوں کو کتنی آسانی کے ساتھ اُڑا دیا گیا ہے۔ شکوک و شبہات کے سارے بادل پھاڑ دیئے گئے ہیں اور ناجائز نفع اٹھانے والوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔

حق تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خاکسار کے رفیق محترم مولوی غلام ربانی ایم اے (عثمانیہ) نے اس فقیر سراپا تقصیر کی جگر کاویوں اور دماغ سوزیوں کے ان نتائج کو بڑے پاکیزہ اسلوب اور دل نشین تعبیر میں اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے۔ اگرچہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میری کتاب کے اس ''جوہری خلاصہ'' کے شائع ہو جانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے، کیونکہ اس ضخیم و مبسوط کتاب کے اکثر جوہری حقائق، اصولی مشتملات اس مختصر کتاب میں محفوظ ہو گئے ہیں، حق تعالیٰ مولوی غلام ربانی کی اس محنت کا

صلہ دین اور دنیا میں عطا کرے، اسلام پر نازک ترین وقت کا خطرہ سامنے آگیا ہے، دوسری چیزوں کے ساتھ مجھے امید ہے کہ اس نازک ترین گھڑی میں یہ مختصر رسالہ بھی انشاء اللہ کافی کارآمد ثابت ہوگا، کم از کم اسلام کی اساسی کتاب جس پر اس دین کی ''بنیاد'' قائم ہے اس پر تو شک و شبہ کی گرد اچھالنے میں انشاء اللہ تعالیٰ اب کوئی بداندیش کامیاب نہیں ہو سکتا۔

'' وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَيَهْدِى السَّبِيْلَ''

کتبہ: مناظر احسن گیلانی (گیلان) بہار

۱۵ ستمبر ۱۹۵۰ء

قرآن کا دوسری آسمانی کتابوں سے تعلق:

تاریخی طور پر اس کا متعین کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہے کہ نسلِ انسانی کو پہلی کتاب خدا کی طرف سے کون سی، کہاں، اور کب ملی۔ قرآن کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ہر امت میں نذیر اور خدا کے نمائندے آسمانی ہدایت کی تعلیم کے لیے آتے رہے اور جس طرح خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی وحی ہوئی اسی طرح ان سے پہلے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد انبیاء علیہم السلام پر ہوتی رہی۔ ارشادِ باری ہے:۔

"إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوْحٍ وَّالنَّبِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِهٖ." (النساء:۱۶۳)

ترجمہ: "ہم نے تم پر وحی اسی طرح کی جیسے نوح پر اور نوح کے بعد پیغمبروں پر وحی کرتے رہے۔"

اس سلسلے میں چند پیغمبروں کے نام لینے کے بعد یہ بھی فرمایا گیا ہے:۔

"وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ." (النساء:۱۶۴)

ترجمہ: "ان پیغام لانے والوں میں سے بعضوں کا حال تم سے ہم نے بیان کیا

اور بعضوں کا حال نہیں بیان کیا ہے۔"

جس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی کے نیک اور بد انجام کو علم و عمل کے نظام پر مرتب کرنے کے لیے اور اسکی تشریح و تعلیم کے لیے پیغمبروں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی تصریح ہے کہ:۔

"شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ." (شوریٰ:۱۳)

ترجمہ: "الدین (یعنی ایسا آئینی دستور جس پر زندگی کے دوسرے دور میں بدلہ دیا جائے اسی کو قانون بنا کر) جو تمہیں دیا گیا یہ وہی دین ہے، جس کی وصیت خدا نے نوح علیہ السلام کو کی اور جس کی وحی ہم نے تم پر کی اور اسی کی وصیت ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کی اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی (اسی کی وصیت کی گئی مقصد یہ تھا اور ہے) کہ اس الدین (اسی دستور کو) قائم کرو اور اس میں بکھرو مت۔"

ایک اور مقام پر یہ فرما کر کہ:

"أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَأْتِ اٰبَآءَهُمُ الْأَوَّلِيْنَ." (المومنون:۶۸)

ترجمہ: "کیا بات کو وہ سوچ نہیں رہے ہیں۔ یا ان کے پاس کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء اولین (اگلے باپ دادوں کو) نہیں دی گئی تھی۔"

اس امر کو واضح الفاظ میں صاف کر دیا گیا کہ انسانی زندگی کا قدرتی دستور العمل جس کی دین و مذہب کیش اور دھرم وغیرہ الفاظ سے لوگ تعبیر کرتے ہیں یہ انسانیت کا ایک

مشترکہ موروثی ترکہ ہے اور اصولاً ایک ہی دستور العمل ہے جس کی پابندی کا مطالبہ اس زمینی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک بنی نوع انسان کی تاریخ کے ہر دور میں کیا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا، آخر قانون کا بنانے والا جب ایک ہو اور جس کے لیے قانون بنایا گیا ہو وہ بھی ایک ہو تو شکل وصورت، چہرہ وبشرہ، رنگ وروغن کے اختلاف سے یا زمین کے کسی خاص خطہ میں سکونت کی وجہ سے جو کسی دریا پہاڑ وغیرہ سے گھرا ہو یا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یا زبان کے اختلاف کی وجہ سے یا انسان جن چیزوں کو استعمال کرتا ہے ان کے بدل جانے کی وجہ سے کیا آدمی کی فطرت بدل جاتی ہے۔

بہرحال جیسا کہ مولانا گیلانی کا خیال ہے کہ زندگی کا وہی دستورِ کہن جو ہمارے آباء اولین کو ملا تھا۔ اصولاً اسی کا اعادہ، اسی کی تجدید کا عمل پچھلی نسلوں میں بھی ہوتا رہا اسی لیے دین یا زندگی کا یہ دستور العمل ہمارا ایک مشترک موروثی ترکہ ہے، البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عطا کیے ہوئے اس آئین کی حفاظت ونگرانی میں بوجوہ مختلف قومیں غفلتوں اور لاپرواہیوں کی شکار ہوتی رہیں۔ خدا کی خالص تعلیم سے ہٹ ہٹ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے خودتراشیدہ رسوم اور دستوروں میں لوگ الجھے رہے۔ مختلف زمانوں اور ملکوں میں زیادہ تر پیغمبروں کی ضرورت اسی عام تاریخی حادثہ نے پیدا کی یعنی جب خدا کی خاص تعلیم اور ہدایت نامہ سے لوگ ہٹ گئے تو پھر اسی موروثی آئینِ کہن کی طرف واپس کرنے کے لیے حق تعالیٰ قوموں اور امتوں میں رسولوں اور پیغمبروں کو پیدا کرتا اور اٹھاتا رہا۔

چاہیے تو یہی تھا کہ مقنن کی شخصی وحدت اور جن کے لیے قانون بنایا ان کی نوعی وحدت کی بنیاد پر لوگ اپنے اس موروثی قانون کو ایک ہی قانون کی حیثیت سے دیکھتے مگر تصدیق وتوثیق، تصحیح اور تکمیل وغیرہ اغراض کے لیے متعدد پیغمبروں کا ظہور مختلف زمانوں

میں جو ہوتا رہا یہ عجیب بات ہے کہ اسی ایک دستور العمل کے پیش کرنے والوں کے اس تعدد وکثرت کو دیکھ کر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مذہب دنیا میں ایک نہیں بلکہ متعدد اور بہت ہیں۔

قرآن گزشتہ آسمانی کتابوں کا آخری ایڈیشن ہے:

بقول حضرت الاستاذ ایک ہی کتاب کو چند آدمی اگر کتب خانہ سے نکالیں تو چند لانے والوں کی وجہ سے کیا وہی ایک کتاب بھی چند ہو جائے گی۔ یقیناً کسی مصنف کی کتاب کے چند ایڈیشن کو دیکھ کر یہ فیصلہ کتنا غلط فیصلہ ہوگا کہ مصنف کی یہ ایک کتاب نہیں بلکہ چند کتابیں بن گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ اپنی اسی نسبت کا مدعی ہے یعنی پچھلی ساری آسمانی کتابوں کا اپنے آپ کو وہ آخری اور مکمل ترین ایڈیشن قرار دیتا ہے اور قوموں کے پاس اس کتاب کے جو پرانے مشتبہ اور مشکوک یا ناقص وغیر مکمل نسخے رہ گئے ہیں ان کے متعلق اس کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس جدید ترین اور کامل ایڈیشن سے مقابلہ کرکے قومیں اپنی موروثی کتابوں کی تصحیح کرلیں، یہی اور صرف یہی ایک مطالبہ قرآن نے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا ہے، ظاہر ہے اس مطالبہ کا مطلب کسی حیثیت اور کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں ہے کہ دنیا کی قوموں کے پاس آسمانی دین اور مذہب اپنے آباؤ اجداد سے جو پہنچا ہے اس دین سے اور اس دین کا انتساب جن بزرگوں کی طرف ہے ان بزرگوں سے بےتعلق ہوکر قرآن کو بالکلیہ ایک جدید دین اور دھرم کی کتاب کی حیثیت سے مانا جائے یقیناً نہ قرآن ہی کا یہ مطالبہ ہے اور نہ قرآن کے ماننے والوں کی طرف سے یہ دعوت دنیا کے سامنے کبھی پیش ہوئی۔(۱)

(۱) اسی سے اندازہ کیجیے کہ عبداللہ بن سلام صحابی رضی اللہ عنہ جو علماء بنی اسرائیل میں (جاری ہے)

....

= سے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی سعادت ان کو حاصل ہوئی تو انہوں نے عرض کیا کہ قرآن کے ساتھ تورات کی تلاوت بھی جاری رکھوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا"اقرأ هذا ليلة وهذا ليلة" یعنی ایک رات قرآن پڑھا کرو اور ایک رات تورات۔ (تذکرۃ حفاظ للذہبی ص:۲۶، ج:۱) طبقات ابن سعد میں بھی ابوالجلاء الجونی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ سات دن میں قرآن اور چھ دن میں تورات ختم کرنے کا عام دستور اپنے لیے انہوں نے مقرر کیا تھا اور ختم کے دن لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ اس دن رحمت نازل ہوتی ہے۔ (ابن سعد ج:۱ ص:۱۶۱) اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن کی صحیح راہ نمائی میں اس قسم کی کتابوں کے پڑھنے سے جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے خود قرآن کے سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے، انجیل و تورات خیر ان کا تو پوچھنا ہی کیا میں سنسکرت سے واقف نہیں ہوں لیکن اردو میں اس کے بعض حصوں کا ترجمہ ہوگیا ہے اس کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا جو یجروید کا ایک ٹکڑا تھا ایک جگہ مجھے یہ فقرہ اس کتاب میں ملا" یعنی اے اگنی تو خوبصورت بچہ ہے، پودوں میں سے نکالا ہوا، تاریکی کو دور کرتا ہوا، ماؤں سے شور کرتا ہوا پیدا ہوا ہے۔" (ادھیا ۱۱/۴۳) کو کہتے ہوئے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے لیکن جو واقعہ پیش آیا اس کا اظہار کرتا ہوں، اس اشلوک نے معاً میرے دماغ کو قرآن کی ان آیتوں کی طرف منتقل کر دیا جن میں ارشاد ہوا ہے کہ" تم دیکھتے ہو اس آگ کو جسے تم پیدا کرتے یا نکالتے ہو، کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا، یا ہم ہیں اس کے اگانے والے۔" (الواقعہ) قریب قریب یہی مضمون سورۃ یٰسین میں بھی ہے۔ عام مفسرین عرب کے بعض خاص درختوں کا ذکر کر کے لکھ دیتے ہیں کہ ان کی شاخوں کو باہم رگڑ کر عرب آگ پیدا کرتے تھے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یجروید کا یہ طرزِ تعبیر قرآن کے طرزِ تعبیر سے اس درجہ ملتا جلتا تھا کہ خیال گذرا کہ کیوں نہیں قرآن میں بھی" درخت" کو عام درخت سمجھا جائے اور جیسے وید میں ہے کہ آگ خوبصورت بچہ ہے پودوں سے نکالا ہوا یعنی آگ کا ظہور لکڑی ہی کے جلنے سے ہوتا ہے اور اسی سے شور کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے، قرآن میں بھی کیا اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔؟ (۱۲ مناظر حسن گیلانی) (اس بحث سے متعلق ضروری نوٹ مقدمہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ عبدالحلیم)

کیا قرآن کسی کو اس کے آبائی اور موروثی دین سے جدا کرتا ہے؟

آج کروڑ ہا کروڑ کی تعداد میں مسلمان دنیا کے اکثر علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں یقیناً ان میں عیسائی، یہودی اور اسی قسم کے دوسری مذہبی امتوں کے لوگ بھی شریک ہیں۔ پھر کیا قرآن کو مان کر جو عیسائی تھے مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کی تکذیب کی، یا جو یہودی تھے مسلمان ہونے کے بعد موسیٰ علیہ السلام یا انبیاء بنی اسرائیل کی توہین کر رہے ہیں یا تورات اور تورات کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کی جو کتابیں ہیں انہیں جھٹلا رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے جو دور ہوگئے تھے قرآن شریف کو مان کر وہی عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی صحیح تعلیم سے پھر قریب ہوگئے اور یہی حال ان ساری قوموں کے ساتھ پیش آیا ہے جو گزشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں قرآن کو مان مان کر اسلامی حلقے میں داخل ہوتی رہی ہیں یعنی اپنے آبائی اور موروثی دین کے جن اجزاء و عناصر کو لوگ کھو بیٹھے تھے یا تاریخی حوادث و واقعات نے ان کے دین کے جن حقائق و مسائل کو مشتبہ و مشکوک بنا کر رکھ دیا تھا۔ قرآن شریف کی راہ سے ان کھوئی ہوئی چیزوں کو انہوں نے پالیا اور شک و ریب کی تاریکیوں میں جو باتیں رل مل گئی تھیں، قرآن کی روشنی میں اب یقین کی آنکھوں سے دیکھنے اور پالینے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ اپنے آباء اولین اور گزشتہ باپ دادوں کے دین سے قرآن پاک کو مان کر قطعاً کوئی الگ نہیں ہوا ہے بلکہ جو الگ ہوئے تھے بلا خوفِ تردید دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے آبائی دین ہی کی طرف خدا کی اس آخری کتاب نے ان سب کو واپس کر دیا ہے۔ اس نے توڑا نہیں ہے بلکہ جو ٹوٹے ہوئے تھے ان کو اپنے بزرگان سلف اور

ان کی سچی تعلیم، صحیح زندگی کے ساتھ جوڑ دیا ہے، واقعہ یہی ہے خواہ دنیا اس کو مانے یا نہ مانے قرآن کی دعوت و تبلیغ کا یہی محوری نصب العین ہے۔ بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ انسانیت کو اسی راہ سے وحدت و وفاق کے مرکزی نقطہ پر وہ ''سمیٹ کر'' لے آنا چاہتا ہے۔

بہرحال یہ تو ایک تمہیدی ذیلی گفتگو تھی، میں آپ کے سامنے اس موروثی دین کی الٰہی کتاب کے آخری ایڈیشن کے ان پہلوؤں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے متعلق بدبختی سے بداندیش دماغوں میں خواہ مخواہ بعض بے بنیاد وساوس و اوہام مختلف راہوں سے گھس پڑے ہیں۔ یعنی قرآن مجید کی تدوین یا جمع و ترتیب کی جو واقعی سرگزشت ہے اسی کے متعلق ایک مختصراً اجمالی بیان ان لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو ناواقفیت کی وجہ سے ان ہی اوہام سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں یا آئندہ مبتلا کیے جا سکتے ہیں۔

قرآن کی تدوین کی مصدقہ شہادتیں:

قرآن کی تدوین یا جمع و ترتیب کے متعلقہ سوالوں پر جن شہادتوں سے روشنی پڑ سکتی ہے آسانی کے لیے ہم ان شہادتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، یعنی شہادتوں کا ایک سلسلہ تو وہ ہے جو خود اس کتاب کے اندر پایا جاتا ہے۔ ہم اندرونی شہادتوں سے اس کی تعبیر کر سکتے ہیں اور دوسرا سلسلہ ان تاریخی روایات کا ہے جن سے اس کتاب کے تدوینی حالات جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ہم ان کو بیرونی شہادتوں سے موسوم کریں گے۔ پہلے ہم اندرونی شہادتوں کو پیش کرتے ہیں۔

اندرونی شہادتیں:

واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے دنیا کی ان تمام کتابوں میں جنہیں قومیں خدا کی طرف منسوب کرتی ہیں شاید قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے متعلقہ سوالات کے جوابات کے لیے قطعاً خود مکتفی ہونے کی حیثیت رکھتی ہے، دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی روایات کا جو ذخیرہ قرآن کے جمع و ترتیب کے متعلق پایا جاتا ہے اگر یہ ذخیرہ نہ بھی پایا جاتا جب بھی اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کے متعلقہ سوالات کے جوابوں کو ہم خود قرآن ہی میں پا سکتے ہیں۔

اس کتاب کا نازل کرنے والا کون ہے؟ کس پر نازل ہوئی؟ کس لیے نازل ہوئی؟ کیا صرف ان ہی بنیادی سوالوں کے جوابات جیسا کہ ہر قرآن پڑھنے والا جانتا ہے اس کتاب میں جگہ جگہ موجود نہیں ہیں! حالانکہ اسی نوعیت کی دوسری کتابوں میں اگر کوئی جاننا چاہے تو انصاف سے بتایا جائے کہ ان سوالوں کا جواب خود ان کتابوں میں کوئی کیا پا سکتا ہے ؟ چونکہ قرآن کی یہ عام باتیں ہیں اس لیے ان سوالوں پر بحث کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے قرآن کی اندرونی شہادتوں کی روشنی میں اس وقت صرف حسب ذیل سوالوں کے جوابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ ابتدائی حالت اس کتاب کی کیا تھی؟ بالفاظ دیگر میرا مطلب یہ ہے کہ جیسے عموماً خدا کی طرف منسوب ہونے والی دوسری کتابوں کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور بھجنوں کی شکل میں وہ رہیں اور صدیوں بعد وہ قلمبند

ہوئیں۔(۱) اس باب میں قرآن کا کیا حال ہے؟

بقول مولانا گیلانی اس سوال کے حل کے لئے اوراق الٹنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۂ بقرہ ہی کی پہلی آیت "ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ" (یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں ہے) اسی فقرہ میں اس سوال کا جواب آپ کو مل جائے گا یعنی خود کتاب کا لفظ جس کے معنی نوشتہ اور لکھی ہوئی چیز کے ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش کرنے والا ابتداء ہی سے اس کو نوشتہ اور مکتوبہ شکل ہی میں پیش کرنا چاہتا ہے اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی مقام پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ قرآن پڑھیے، تقریباً ہر بڑی سورت میں کتاب یا نوشتہ ہونے کی اسی تعبیر کا مسلسل ذکر آپ کو ملتا چلا جائے گا، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ کفار عرب کا یہ فقرہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے یعنی وہ کہا کرتے تھے کہ:

"اِکۡتَتَبَهَا فَهِیَ تُمۡلٰی عَلَیۡهِ بُکۡرَةً وَّأَصِیۡلًا." (الفرقان:۵)

ترجمہ: "لکھ لیا ہے اس شخص نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو (یعنی قرآن کو) پس

(۱) حد یہ ہے کہ اس سلسلے میں کتابوں کے جس مجموعے کو دنیا کا قدیم ترین مجموعہ عموماً سمجھا جاتا ہے یعنی ہمارے ملک کی آکاش بانی وید کے متعلق آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ قرآن مجید جو اس سلسلے کی آخری کتاب ہے اس کے پانچ چھ سو سال بعد قلمبند ہوئی۔ البیرونی جو دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس کی آمد سے کچھ ہی دن پہلے ایک کشمیری پنڈت نے وید کو کتابی قالب عطا کیا ورنہ اس سے پہلے پشتہا پشت سے برہمنوں کا ایک خاص طبقہ اس کو زبانی یاد کرتا چلا آرہا تھا۔ (دیکھو کتاب "ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی معاشرت واقتصادی حالت" از عبداللہ یوسف علی۔ صفحہ:۷۱) ڈاکٹر گپتا نے اپنی کتاب "ہندی فلسفہ" میں لکھا ہے کہ عموماً ویدوں کے قلمبند کرنے کو زمانہ تک کفر سمجھا جاتا تھا۔ برہمن اپنے استادوں سے سُن کر زبانی یاد کر لیتے تھے اسی لیے اس کا نام "اسرتی" تھا۔ (دیکھو "ہندی فلسفہ" ج:۱ ص:۱۶ مترجمہ دارالترجمہ حیدرآباد۔)

وہی پڑھا جاتا ہے اس پر صبح شام۔"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی کتابت اور نوشتگی ایک عام اور پھیلی ہوئی بات تھی جسے وہ بھی جانتے تھے جنہوں نے اب تک اس کو خدا کی کتاب بھی نہیں مانا تھا۔

ماسوا اس کے اس کتاب یا نوشتے کے متعلق اس قسم کے ذیلی سوالات یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا۔ پیغمبر تو خود اُمّی تھے لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے پھر کن لوگوں سے اس کو لکھواتے تھے آپ چاہیں تو ان سوالات کے جوابوں کو بھی قرآن ہی میں تلاش کر کے پاسکتے ہیں۔ مثلاً پہلا سوال یعنی قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا۔ اس کے لئے قرآن میں ہی پڑھیے:۔

"وَالطُّوۡرِ وَکِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ فِیۡ رَقٍّ مَّنۡشُوۡرٍ. (۱)" (الطّور:۱)

ترجمہ: "قسم ہے (کوہِ) طور کی اور لکھی ہوئی کتاب کی جو باریک جھلّی کھلی ہوئی پر لکھی ہوئی ہے۔"

جیسا کہ معلوم ہے کہ "رق" ایک خاص قسم کی باریک جھلّی کو کہتے ہیں جو لکھنے کے کام کے لیے تیار کی جاتی تھی انگریزی میں جسے پارچمنٹ (PARCHMENT) کہتے ہیں اور قدیم زمانہ کی تورات، انجیل وغیرہ جیسی کتابیں اسی پر لکھی ہوئی اب بھی ملتی ہیں۔ قرآن یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس کی کتابت بھی "رق" ہی پر ہے۔ اسی طرح اس کی خبر دیتے ہوئے کہ قرآن تو چونک پیدا کرنے والی ایک چیز ہے اسی کی صفت میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

(۱) تفسیر فتح البیان ج:۹، ص:۲۸ میں دیکھیے کہ کتاب مسطور جو رق منشور میں لکھی ہوئی ہے اس سے مراد قرآن ہے۔۱۲

"فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ." (عبس:۱۳،۱۴،۱۵،۱۶)

ترجمہ: ''صحیفوں میں لکھا ہوا ہے ایسے صحیفے جو مکرم ومحترم ہیں پاک ہیں لکھے ہوئے ہیں ہاتھوں سے ان لکھنے والوں کے جو بڑے بزرگ اور پاکباز لوگ ہیں۔''

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوا کہ قرآن صحیفوں میں لکھا جارہا تھا بلکہ اس کے لکھنے والوں کی ان اعلیٰ خصوصیات کا بھی اظہار کیا گیا ہے جن میں صحت نویسی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے اس قسم کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ مثلاً:۔

"لَايَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ." (الواقعہ:۷۹)

ترجمہ: ''نہیں چھوئیں اس کو (یعنی قرآن کو) مگر وہی لوگ جو پاک ہوں۔''

مگر نہیں سوچتے کہ زبانی یادداشت کی شکل میں جو چیز ہوگی کسی حیثیت سے بھی یہ حکم یعنی مس اور چھونے کی ممانعت کا تصور اس کے متعلق کیا جاسکتا ہے جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک نوشتہ اور مکتوبہ شکل میں پیش کیا ہے جس کے مس اور چھونے جانے کا بھی امکان تھا ورنہ ممانعت یقیناً ایک بے معنی سی بات ہوجاتی ہے۔

علاوہ اس کے تدریجی نزول یعنی وقفہ وقفہ سے قرآنی آیتیں جو اُتر رہی تھیں اور "جُمْلَةً وَّاحِدَةً" (الفرقان:۳۲) یعنی ایک ہی دفعہ ان کو نازل نہیں کیا گیا اس کی وجہ جو یہ بیان کی گئی ہے کہ:

"لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ" (الفرقان:۳۲)

ترجمہ: ''تاکہ ہم جمائیں اس کے ساتھ تیرے دل کو۔''

ظاہر ہے کہ قرآن کو دل میں جمانے یعنی یاد کرنے میں خود پیغمبر کو نزول کے اسی تدریجی طریقہ سے بہ سہولت موقع مل سکتا تھا۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ:

"وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ." (الاسراء:۱۰۶)

ترجمہ: ''قرآن (جس کی آیتوں کو) جدا جدا کرکے ہم نے اتارا (یہ اس لئے کیا گیا) تاکہ لوگوں پر وقفہ کے ساتھ اس کتاب کو تم پڑھو۔''

اس تدریجی نزول کی وجہ یہ تھی جو بیان کی گئی کہ لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھنے کا موقع اسی طرح مل سکتا ہے گویا علاوہ پیغمبر کے دوسرے لوگوں کو بھی قرآن شریف کے زبانی یاد کرانے کی بھی تدبیر ہوسکتی تھی اس تدبیر میں جو کامیابی ہوئی اس کی خبر دیتے ہوئے قرآن ہی میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ:۔

"بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ." (عنکبوت:۴۹)

ترجمہ: ''بلکہ وہ (یعنی قرآن) تو کھلی ہوئی واضح آیتوں کا (مجموعہ ہے) جو ان لوگوں کے سینوں میں ہے جنہیں علم دیا گیا ہے۔''

مطلب یہی ہوا کہ علاوہ کتابی قالب میں محفوظ ہونے کے صحابیوں میں اہلِ علم کا جو طبقہ تھا قرآن اطلاع دیتا ہے کہ ان کے سینوں میں بھی وہ محفوظ ہوتا چلا جارہا تھا۔ نیز سورۂ مزمل کے آخری رکوع میں:

"فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ." (المزمل:۲۰)

ترجمہ: ''پس پڑھو تم لوگ جتنا آسانی سے ہوسکے قرآن کو۔''

کے حکم کو نافذ کرتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ قرآن ہی میں کیا گیا ہے کہ پیغمبر ہی نہیں بلکہ پیغمبر کے صحابیوں کا ایک طائفہ اور گروہ بھی:

"أَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ." (المزمل:۲۰)

ترجمہ: "رات کے دو تہائی یا آدھے یا تہائی حصہ میں۔"

کھڑے ہوتے ہیں اور قرآن کو دہراتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق:

"يَتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ." (آل عمران:۱۱۳)

ترجمہ: "پڑھتے ہیں اللہ کی آیتوں کو رات اور دن کے وقت میں۔" (۱)

وغیرہ آیتوں میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ صبح وشام ان کا مشغلہ اپنے یاد کیے ہوئے قرآن کا اعادہ اور تکرار تھا۔

قرآن کی اندرونی شہادتوں کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کی حفاظت کا سامان کتابۃً وحفظاً یعنی لکھ کر اور زبانی یاد کر کے جو کیا گیا تھا اس کے لئے کسی بیرونی شہادت کی ضرورت ہے۔؟ خود قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت خود اس کتاب کے محفوظ کرنے کا سامان اس حد تک کر چکی تھی کہ دوسری آسمانی کتابوں کے ساتھ مختلف حوادثات وواقعات جو پیش آتے رہے ان کا قطعی طور پر شروع ہی سے انسداد کر دیا گیا تھا۔ سورۃ البروج میں ہے:۔

"هَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ." (البروج:۱۸)

ترجمہ: "کیا تمہارے پاس جتھوں کی خبر پہنچی ہے یعنی فرعون اور ثمود کے جتھوں

(۱) اصل کتاب میں یوں تھا "یتلون ایات اللہ باللیل والنہار" (پڑھتے ہیں اللہ کی آیتوں کو رات میں بھی اور دن میں بھی) لیکن ان الفاظ کے ساتھ آیت قرآن میں نہیں ہے لہذا اس کو بدل دیا گیا۔ عبدالحلیم

کی۔"

اس سوالیہ فقرے کے بعد قرآن ہی میں اس دعوے کا اعلان کیا گیا یعنی:

"بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ." (البروج:۲۱)

ترجمہ: "بلکہ وہ تو بلند و بالا قرآن ہے لوح محفوظ میں۔"

بقول مولانا گیلانی اس کا بظاہر یہی مطلب ہوتا ہے کہ فرعون وثمود جیسی قوموں کی سی جبار حکومتوں کی طاقت بھی قرآن کو غیر محفوظ کرنے کی کوشش کسی زمانہ میں بھی خدانخواستہ اگر کرے گی تو ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تیرہ سو سال سے قرآن کے اس دعوے کی جو دوست نہیں ہیں، وہ بھی تصدیق کر رہے ہیں۔

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔" (اعجاز التنزیل ص:۵۰۰)

یہ ایک غیر مذہب کے آدمی "وان ہیم" (جرمنی) کا ایسا منصفانہ اعتراف ہے کہ جو قرآن کی تاریخ سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہے، خدا کا کلام اس کو نہ بھی مانے لیکن "وان ہیم" نے جو بات کہی ہے اس کے اعتراف واقرار پر تو اپنے آپ کو وہ بہر حال مجبور پائے گا۔

ناقابل انکار تاریخی حقیقت:

واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کو جن خصوصیتوں کے ساتھ دنیا کے حوالے کیا تھا ابتداء سے اس وقت تک بغیر ادنیٰ تغیر وتبدل اور سرِ مو تفاوت کے وہ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ کروڑہا کروڑ مسلمانوں میں اس طریقہ سے منتقل ہوتی ہوئی چلی

آ رہی ہے کہ سال دوسال تو خیر بڑی بات ہے ایک لحہ کے لئے بھی نہ قرآن ہی مسلمانوں سے کبھی جدا ہوا اور نہ مسلمان قرآن سے جدا ہوئے اور اب تو طباعت واشاعت وغیرہ کے لامحدود ذرائع کی پیدائش کا نتیجہ یہ ہو چکا ہے کہ میؔر وسوؔدا کی غزلوں یا اسی قسم کی دوسری معمولی چیزوں کو کوئی اب دنیا سے مٹا نہیں سکتا تو قرآن کے مٹنے مٹانے کا بھلا اب امکان ہی کیا باقی رہا؟

اس وقت تک میں نے قرآن کی انہی اندرونی شہادتوں کا ذکر کیا ہے جن کے نتائج اور مفاد کو وہ بھی مانتے ہیں اور ان کو ماننا بھی چاہیے جنہوں نے اب تک اس کتاب کو خدا کی کتاب تسلیم نہیں کیا ہے۔ باقی قرآن جن کے نزدیک خدا کی کتاب ہے ان کے لئے تو اس سلسلہ میں بقول مولانا گیلانی (۱) خود قرآن ہی نے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔

"لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ." (فصلت:۴۲)

ترجمہ: ''قرآن میں نہ سامنے سے الباطل کے گھسنے کی گنجائش ہے اور نہ پیچھے سے۔''

اس کا حاصل یہی تو ہے کہ الباطل (یعنی قرآن کا جو جز نہیں ہے) اس کے لئے خدا نے ذمہ داری لی ہے کہ چاہنے والے کسی راستہ بھی چاہیں کہ قرآن میں اس کو داخل کر دیں تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کو خدا کے الفاظ جو تسلیم کر چکا ہے کیا وہ اپنے آپ کو مسلمان باقی رکھ سکتا ہے اگر کسی لفظ یا شوشہ تک کے اضافہ کا قرآن میں وہ تصور

(۱) قرآن میں بیشی اور کمی یا اضافہ ونقص کے عدم امکان کے اس مسئلہ کا استنباط قرآنی آیتوں ہی سے مولانا گیلانی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے اور یہ مضمون اسی سے ماخوذ ہے۔

کر سکے؟

اور جو حال اضافہ کا ہے بجنسہٖ یہی کیفیت کمی کی بھی ہے۔ مولانا گیلانی نے اس سلسلہ میں سورۃ القیامۃ کی آیت "إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" (القیامۃ :۱۷، ۱۸) کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اگرچہ نئے مگر بالکل صحیح نتائج پیدا کئے ہیں، مولانا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کا اتارنے والا خدائے ذوالجلال جب خود فرماتا ہے:۔

"إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ ." (القیامۃ:۱۷)

ترجمہ: ''قطعاً ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے۔''

تو اس کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے کہ قرآن میں جن چیزوں کو خدا جمع کر چکا ہے ان کو قرآن سے کوئی نکال دے یا اپنی جگہ سے ہٹا دے بلکہ اسی کے بعد اگر غور کیا جائے تو "قرانہ" کے لفظ کا اضافہ "جمعہ" کے بعد بلا وجہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ سمجھا جائے تو نظر آئے گا کہ بعض پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کا اس میں سامان مل سکتا ہے، سوال ہو سکتا تھا کہ صرف جمع کرنے اور باقی رکھنے کی ذمہ داری "إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ" کے الفاظ سے لی گئی ہے جس کا مفاد یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کے کسی جز کو خدا غائب نہ ہونے دے گا اور قرآن دنیا میں اپنے تمام اجزاء کے ساتھ رہتی دنیا تک موجود رہے گا۔ لیکن اسی دنیا میں بیسیوں کتابیں ایسی ہیں جن کا پڑھنے والا اب کوئی باقی نہیں رہا، ایسی صورت میں کتاب کا دنیا میں رہنا نہ رہنا دونوں باتیں برابر ہیں۔ اب اگر سوچئے تو اس خطرہ کا جواب "قرانہ" کے لفظ میں آپ پا سکتے ہیں یعنی اس کی بھی ذمہ داری "قرانہ" کے لفظ سے لی گئی کہ قیامت تک اس کتاب کے پڑھنے والوں کو خدا پیدا کرتا رہے گا۔ اور اس وقت تک یہ ذمہ داری جیسا کہ دنیا دیکھ رہی ہے خدا پوری کر رہا ہے، آخر اس "قرانہ" کا مطلب اس

کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ جیسے قرآنی اجزاء کے جمع رکھنے کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے اسی طرح اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی ہے۔ آگے سوال ہوسکتا تھا کہ پڑھنے والے بھی باقی رہیں لیکن سمجھنے اور سمجھانے والے غائب ہوجائیں تو اس وقت بھی کتاب کا افادہ ختم ہوجائے گا جیسے آج مثلاً وید کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان اتنی پرانی ہوچکی ہے کہ لغت کی مدد سے بھی اس کا سمجھنا مشکل ہے۔(۱)

اسی وسوسہ کی ضمانت اللہ تعالیٰ کے قول:۔

"ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" (القیامۃ:۱۸)

ترجمہ: "پھر ہم ہی پر ہے اس کا بیان بھی۔"

کے الفاظ میں آپ پاسکتے ہیں۔ آخر جس کتاب کے معانی ومطالب کے بیان وتشریح کی ذمہ داری اس خدا نے لی ہو جس کا وجود ماضی وحال ومستقبل سب سے مساوی تعلق رکھتا ہے تو کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کو تاریخ کے ہر دور میں کیوں پوری نہ فرمائے گا؟ قرآن سے یہی سمجھ آتا ہے اور یہی دیکھا بھی جارہا ہے کہ ہر زمانہ کے اقتضاء کے مطابق قرآنی معانی ومطالب کی تشریح وتعبیر کرنے والے مسلسل چلے آرہے ہیں۔ دراصل انہی تفصیلات کا اجمالاً ذکر قرآن کی مشہور آیات میں فرمایا گیا ہے جسے عموماً مولوی اپنے وعظوں میں لوگوں کو سناتے ہی رہتے ہیں۔ یعنی:۔

"إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ." (الحجر:۹)

(۱) پنڈت سمندر لال جی اپنی مشہور کتاب "گیتا" اور قرآن میں وید کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی (یعنی ویدوں کی) زبان اتنی پرانی اور عجیب ہے اور ایک ایک منتر کے اتنے اتنے ارتھ لگائے جاسکتے ہیں کہ بے پڑھے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ودوانوں (علماء) کے لئے بھی ہزاروں برس سے وید ایک پہیلی رہا ہے اور ہمیشہ پہیلی ہی رہے گا۔ (ص:۹۹ کتاب مذکور کا اُردو ایڈیشن)

ترجمہ: "ہم ہی نے اس ذکر (چونک پیدا کرنے والی کتاب) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنے والے ہیں۔"

بہرحال بیرونی شہادتوں سے اگر قطع نظر بھی کرلیا جائے تو قرآن کی اندرونی شہادتوں ہی سے ان سارے سوالوں کے جوابوں کو ہم حاصل کرسکتے ہیں جو قرآن جیسی کسی کتاب کے متعلق دلوں میں پیدا ہوسکتے ہیں۔

قرآن میں نوشت وخواند سے متعلق الفاظ:

انتہاء یہ ہے کہ قرآن کے عہد نزول میں عرب کے ماحول کی جو نوعیت نوشت وخواند کے لحاظ سے تھی عرب کی صحیح تاریخ کا جنہوں نے مطالعہ نہیں کیا ہے نیز قرآن ہی کی ایک اصطلاح یعنی لفظ "جاہلیت" کے اصطلاحی معنی سے واقف ہونے کی وجہ سے بعض لوگ اس مغالطہ میں جو مبتلا ہوجاتے ہیں کہ جاہلیت کیا اُس دور میں قرآن کی کتابت کے امکان کی صورت ہی کیا تھی؟ انہوں نے باور کرلیا ہے کہ عرب میں نہ لکھنے والے پائے جاتے تھے اور نہ لکھنے پڑھنے کا سامان اس وقت اس ملک میں موجود تھا، مگر کاش معترضین کا یہ گروہ صرف قرآن ہی کا مطالعہ کرلیتا تو اس کتاب میں بار بار رق، قرطاس، صحیفہ، صحف،(۱) قلم، زُبر، الواح، مداد (روشنائی)، اسفار، کتب وغیرہ، الغرض ایسی ساری چیزیں جن کا عموماً نوشت وخواند سے تعلق ہے۔ "ان کے ذکر سے قرآن پاک آپ کو لبریز نظر آئے گا۔ اور یہ تو لکھنے پڑھنے کے سامان کا حال ہے، باقی رہا لکھنے والے، سو حیرت ہوتی ہے کہ عرب کے

(۱) رق، قرطاس، صحیفہ، صحف ان چاروں الفاظ سے وہ اوراق سمجھ میں آتے ہیں جن پر ایام جاہلیت میں لوگ لکھتے تھے، جو جھلی یا باریک کھالوں سے بنائے جاتے تھے۔۱۲

اُس زمانے کے باشندوں کی طرف قرآن ہی میں:

"یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ." (البقرۃ:۷۹)

ترجمہ: "لکھتے ہیں وہ لوگ کتاب اپنے ہاتھوں سے اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس سے آئی ہوئی کتاب ہے۔"

پڑھتے ہیں پھرلین دین کے جس قانون کا طویل بیان سورۂ بقرہ کے آخر میں پایا جاتا ہے اور تاکید کے ساتھ قرضی معاملات کے لکھنے کا اصرار قرآن نے جو کیا ہے سوچنا چاہیے کہ ان امور کا انتساب ان لوگوں کی طرف کسی حیثیت سے بھی صحیح ہوسکتا ہے جو نوشت وخواند سے قطعاً بیگانہ اور ناآشنا ہوں۔"

قرآن میں جاہلیت کے معنی:

رہا جاہلیت کا لفظ سو میں بیان کرچکا ہوں کہ یہ قرآن کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے، متعدد مقامات پر اس نے اپنی اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

"وَلَاتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی." (الاحزاب:۳۳)

ترجمہ: "اور نہ بناؤ سنگار کرو جاہلیتِ اولیٰ والوں کے بناؤ سنگار کی طرح۔"

(۱) اسی سلسلہ کا مشہور لطیفہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عرب کے مضری قبیلہ سے نسلی تعلق رکھتے تھے، جب آپ کے مقابلہ میں مضری قبیلے کے دوسرے حریف عربی قبیلے ربیعہ کے ایک آدمی مسیلمہ نے بھی نبوت کے دعوے کا اعلان کردیا تو لکھا ہے کہ "طلحۃ المزی" قبیلہ ربیعہ کا ایک سردار مسیلمہ (جاری ہے)

یا عرب پر "نسلی ولسانی" اور وطنی حمیتوں کا جو بھوت سوار تھا۔ (۱) اس کی تعبیر "حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ" سے کی گئی ہے یا خدا کے متعلق ارتیابی (ایگناسٹک) ذہنیت عام عربوں پر جو مسلط تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:۔

"یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ." (آل عمران:۱۵۴)

ترجمہ: "اور خیال رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ جاہلیت کے خیالات۔"

اب آپ ہی بتایئے کہ کسی جگہ پر بھی "جاہلیت" کے اس لفظ سے وہ مطلب سمجھا جاتا ہے جو اِس زمانے کے جاہلوں اور ناواقفوں نے سمجھ رکھا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کے مقابلہ میں عربوں کی غیر اسلامی زندگی اخلاقاً واعتقاداً جو کچھ بھی تھی اور جن خصوصیتوں کی حامل تھی دراصل اسی کی تعبیر قرآن جاہلیت سے کرتا ہے۔ بہرحال یہ بات کہ اسلام سے پہلے نوشت وخواند سے عرب کے لوگ چونکہ ناواقف تھے اس لئے ان کے زمانہ کو قرآن جاہلیت کا زمانہ قرار دیتا ہے، یہ وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن سے بھی جاہل ہے

= کے پاس آیا۔ گفتگو کے بعد طلحہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو (مسیلمہ) جھوٹا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ طلحہ نے کہا کہ ربیعہ کا کذاب (جھوٹا) مضر کے صادق (راست باز) سے مجھے زیادہ محبوب ہے، اس کے بعد مسیلمہ کے رفقاء میں شریک ہوگیا۔ (ص:۲۸۶، طبری ج:۳، طبع دارالمعارف مصر ۱۹۶۰) مسیلمہ کے دعوے کی بنیاد قومی حمیت وعصبیت پر مبنی تھی۔ اس کا پتہ ان فقروں سے بھی چلتا ہے جو قرآن کے مقابلہ میں شریر بنایا کرتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے سنانے والے نے سنایا تھا کہ مسیلمہ یہ بھی کہتا تھا "یاضفدع نقی نقی لاالشارب تمنعین ولا الماء تکدرین لنا نصف الارض ولقریش نصف الارض ولکن قریشا قوم یعتدون." (اے مینڈک کی ٹراٹرتو نہ پانی پینے والوں کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گدلا کرتی ہے، زمین عرب کی آدھی ہماری یعنی ربیعہ والوں کی اور آدھی قریش کی مگر قریش تو زیادتی سے کام لے رہے ہیں۔ (ص:۳۰۰، ج:۳ طبری)

اور ایامِ جاہلیت کی تاریخ سے بھی۔

بیرونی شہادتیں:

قرآن کی ان اندرونی شہادتوں کے اجمالی بقدرِ ضرورت تذکرہ کے بعد اب میں بیرونی شہادتوں کی طرف پڑھنے والوں کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر سب سے پہلے شیعی فاضل ''علامہ طبرسی'' کے خیالات کا پیش کرنا مناسب ہوگا انہوں نے اپنی تفسیر **''مجمع البیان''** میں لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے۔

> **''إن العلم بصحة نقل القران كالعلم بالبلدان والحوادث الكبار والوقائع العظام والكتب المشهورة.''** (مقدمه روح المعانی، ج:۱ص:۲۴، طبع مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

> ترجمہ: ''یعنی قرآن اپنی اصلی حالت کے ساتھ گزشتہ نسلوں سے منتقل ہوتے ہوئے پچھلی نسلوں تک پہنچا ہے، اس واقعہ کے علم کی نوعیت وہی ہے جو بڑے بڑے شہروں یا مشہور حوادث اور اہم تاریخی واقعات یا مشہور کتابوں کے علم کی ہے۔''

بلاشبہ واقعہ یہی ہے، آج نیویارک اور لندن کے وجود میں شبہ یا شک جیسے جنون ہے یا جنگِ عظیم کے حادثہ کا منکر پاگل سمجھا جائے گا۔ یقیناً متواتر اور متوارث ہونے میں بجنسہٖ یہی حال قرآن مجید کا بھی ہے، یہ ایک واقعہ ہے کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں ایک لحہ کے لئے نہ مسلمان ہی اس کتاب سے جدا ہوئے اور نہ یہ کتاب ہی مسلمانوں سے جدا ہوئی جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سپرد کر کے دنیا سے تشریف لے گئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مسلمانوں کے سپرد اس کتاب کو کیا تھا، ان کی تعداد

لاکھوں سے متجاوز تھی پھر ان ہی لوگوں نے اپنی بعد کی نسلوں تک اسے پہنچایا جن کی تعداد بلا مبالغہ کروڑوں سے بھی آگے بڑھ چکی تھی اور یونہی طبقۃً بعد طبقۃٍ نسلاً بعد نسلٍ نوشتہ ومکتوبہ شکل میں یہ کتاب مسلمانوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے، پس سچی بات یہی ہے کہ قرآن تو قرآن ایسی کتابیں جیسے نحو میں ''سیبویہ'' کی یا اصول میں ''المزنی'' کی کتاب ہے بقول ''علامہ طبرسی'' کے:۔

> **''لو أن مدخلا أدخل فی كتاب سيبويه بابا من النحو ليس من الكتاب لعرف وكذاالقول فی كتاب المزنی.''** (روح، ص:۲۴، ج:۱)

> ترجمہ: ''اگر سیبویہ اور مزنی کی کتابوں میں کوئی شخص اپنی طرف سے کسی چیز کو داخل کر دے تو فوراً یہ بات پہچان لی جائے گی۔''

تو پھر قرآن میں اضافہ یا کمی کے امکان کی بھلا کیا صورت ہے، اسلامی ممالک کے کسی ابتدائی مکتب کا ایک بچہ بھی اس شخص کو ٹوک سکتا ہے جو فتحہ (زبر) کی جگہ کسی حرف کو رفع (پیش) کے ساتھ پڑھے گا، جس کا جی چاہے اس کا تجربہ ہر جگہ کر سکتا ہے۔

تواتر اور توارث کے اس عام قصہ کے سوا قرآن کے جمع و ترتیب کے سلسلہ میں بیرونی روایتوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے میرے نزدیک ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حصہ تو ان روایتوں یا شہادتوں کا ہے جن سے قرآن کے بعض اجمالی بیانات یا شہادتوں کی شرح ہوتی ہے۔ ہم پہلے انہی کا ذکر کرتے ہیں۔

تشریحی روایات:

مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کا نزول وقفہ وقفہ سے تدریجاً جو ہوتا رہا آپ سُن چکے ہیں کہ یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے اور ایک سے زائد مقام پر اس دعوے کا ذکر خود قرآن ہی میں کیا گیا ہے، اس دعوے کی تفصیل روایتوں میں یہ ملتی ہے کہ قرآن کی ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں کی حیثیت دراصل مستقل کتابوں یا رسالوں کی قرار دی گئی تھی، مثلاً اس کو یوں سمجھیے کہ تاریخ، فلسفہ، اقلیدس، طب اور جغرافیہ وغیرہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو ایک ہی مصنف اگر تصنیف کرنا شروع کرے اور تصنیف میں یہ طریقہ اختیار کرے کہ جس کتاب کا جو مواد فراہم ہوتا جائے اس کو متعلقہ کتاب میں درج کرتا چلا جائے اور یوں آہستہ آہستہ دس بیس برس میں آگے پیچھے اس کی یہ ساری تصنیفیں ختم ہوں، واقعہ یہ ہے کہ کچھ یہی کیفیت قرآنی سورتوں یا ان مستقل رسالوں کی ہے۔ (۱) جن کے مجموعہ کو ہم قرآن کہتے ہیں۔

(۱) قرآن ہی میں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کرتے ہوئے یہ جو فرمایا گیا ہے "رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" (البینة: ۲، ۳) (اللہ کی طرف سے پیام لاتے ہیں پڑھتے ہیں پاک صحیفوں کو جن میں استوار اور مضبوط لازوال (تعلیم دوامی) کتابیں ہیں۔ اس میں "کتب" کے لفظ کو "کتاب" کی جمع قرار دینا قطعاً لغت کی خلاف ورزی نہیں ہے اور مراد ان سے قرآن کی بھی متعدد کتابیں یا رسالے ہوں جنہیں ہم اصطلاحاً قرآن کی سورتیں کہتے ہیں تو انکار کی کیا کوئی معقول وجہ ہوسکتی ہے؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صحف میں کتابوں کے ہونے کی ترکیب میں لوگوں نے جو دُشواریاں پیدا کر کے طرح طرح کی دوراز کار تاویلیں کی ہیں ان کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی صرف سیدھا ترجمہ یہ ہو جاتا ہے کہ پاک اوراق جن میں استواء اور مستحکم کتابیں یعنی سورتیں لکھی ہوئی ہیں۔۱۲ (مناظر حسن گیلانی)

بتدریج تیئیس (۲۳) سال میں ان سب کے نزول کا سلسلہ ختم ہوا۔ ان سورتوں میں کوئی سورۃ اختتام تک پہلے پہنچی، اور کوئی بعد میں۔ یہی مطلب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کا ہے جو ابوداؤد، نسائی اور ترمذی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

"أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان مما يأتي عليه الزمان ينزل عليه السور ذات العدد." (مختصر كنز العمال برحاشيه مسند أحمد ج:۲، ص:۴۸، طبع المكتب الاسلامي بيروت طبع پنجم ۱۹۸۵ء)

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سُورتیں اُترتی رہتی تھیں (یعنی ایک ہی زمانہ میں مختلف سورتوں کے نزول کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔"

اسی روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ ذوات العدد (متعدد) سورتیں تدریجی طور پر جو نازل ہو رہی تھی ان کے لکھوانے اور قلم بند کرانے کا طریقہ یہ تھا:۔

"وكان اذا نزل عليه الشئ يدعو بعض من كان يكتب عنده فيقول ضعوا هذا في السورة التي يذكر فيها كذا وكذا." (۱) (مختصر كنز العمال: ۲، ص:۴۸)

ترجمہ: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی چیز نازل ہوتی تو جو لکھنا جانتے تھے ان میں سے کسی کو آپ طلب فرماتے اور کہتے کہ اس آیت کو اس سورۃ میں لکھو

(۱) ابوداؤد، ج:۱، ص:۳۵۰ (طبع دار ابن حزم بیروت ۱۹۹۷ء)، ترمذی، ج:۵، ص:۱۶۶ (طبع دار الغرب الاسلامی تحقیق بشار عوار)، مستدرک حاکم، ج:۳، ص:۶۳ (دار المعرفة بیروت ۱۹۹۸ء)۔ عبدالحلیم

جس میں فلاں باتیں یا آیتیں ہیں۔"(۱)

مطلب وہی ہے کہ طب کے متعلقہ مضامین کو طب کی کتاب میں اور تاریخ کے مواد کو تاریخ کی کتاب میں مذکورہ بالا طریقہ تصنیف اختیار کرنے والا مصنف جیسے داخل کرتا چلا جاتا ہے اسی طرح قرآنی آیات کو ان کی متعلقہ سورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شریک کرنے کا حکم دیا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم جبریل علیہ السلام دیتے تھے۔

جیسا کہ معلوم ہے خود قرآن ہی نے:

"وَلَاتَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِکَ ." (عنکبوت:۴۸)

ترجمہ: "اور نہ لکھا ہے اس کو تم نے اپنے ہاتھ سے۔"

کی خبر دیتے ہوئے اس کا انکشاف کیا ہے کہ صاحبِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہیں بلکہ اپنے صحابیوں میں سے چالیس سے اوپر حضرات کو اس کام کے لئے مقرر کر رکھا تھا کہ جس وقت قرآن کی جس سورۃ کی جن آیتوں کی وحی ہو فوراً پہنچ کر ان کو لکھ لیا کریں۔"العراقی" نے "منظومہ" سیرت میں ان کاتبوں کے نام گناتے ہوئے نظم کی ابتداء اس مصرعہ سے کی ہے:۔

(۱) اور مسند احمد میں یہ روایت ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "أتانی جبرئیل فأمرنی" (جبرئیل آئے اور مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو اس سورۃ کی فلاں جگہ پر رکھوں)(۱) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں میں نازل ہونے والی آیتوں کو جبرئیل علیہ السلام کے حکم سے آپ شریک کرتے تھے (دیکھو مختصر کنز العمال ص:۴۰، ج:۲) جس کا مطلب یہی ہوا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلکہ ہر آیت جس سورۃ میں جس مقام پر ہے یہ کام بھی جبرئیل علیہ السلام ہی کے حکم سے ہوا ہے۔ مناظر احسن

(۱) علامہ ہیثمیؒ مجمع الزوائد ج:۷، ص:۴۸ پر یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "رواہ أحمد واسنادہ حسن" یعنی امام احمدؒ نے اسکو مسند میں روایت کیا ہے اور اسکی سند حسن ہے۔ عبدالحلیم

ف " كتابه اثنان وأربعون"(۱)

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کی تعداد بیالیس (۴۲) تھی۔"

کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ لے تو دوسرا اس کو انجام دیدے۔"عقد الفرید" میں ابن عبدربہ نے حضرت حنظلہ بن ربیع (رضی اللہ عنہ) صحابی کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:۔

"ان حنظلة بن ربيع كان خليفة كل كاتب من كتابه عليه السلام اذا غاب عن عمله." (عقد الفريد ج:۳ ص:۶، التراتيب الاداريه، ج:۱، ص:۱۱۸)

ترجمہ: "حنظلہ بن ربیع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کاتبوں کے خلیفہ اور نائب تھے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو یہ حکم تھا کہ خواہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور رہیں تاکہ کاتبوں میں سے اتفاقاً وقت پر اگر کوئی نہ ملے تو کتابت وحی کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ واقع ہو۔ اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قید کتابت میں آکر قلم بند ہو جاتی تھی۔ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے طبرانی کے حوالہ سے مجمع الزوائد میں یہ روایت ہیثمی نے نقل کی ہے۔

"قالت كان جبرئيل عليه السلام يملى على النبى صلى الله عليه وسلم." (رواه الطبرانى فى الاوسط، ج:۸، ص:۱۲۸، طبع مکتبہ

(۱) دیکھو الکتانی کی کتاب "التراتیب الاداریہ" ج:۱، ص:۱۱۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت۔ اسی کتاب میں ان بیالیس (۴۲) کاتبوں کے نام بھی مل جائیں گے۔

المعارف ریاض ۱۹۹۵ء تحقیق محمود طحان ، **مجمع الزوائد ج:۷،ص:۱۵۷)**

ترجمہ: ''ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کولکھواتے تھے۔''

بظاہر اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اُترنے کے ساتھ ہی جبرئیل علیہ السلام کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ آیتوں کولکھوادیا کرتے تھے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ معلوم ہے کہ نہ لکھنا جانتے اور نہ قرآنی آیتوں کوخودلکھا کرتے تھے۔انتہا اس احتیاط کی یہ تھی کہ جب ''غَیۡرُ اُولِی الضَّرَرِ'' کے الفاظ بطور اضافہ کے ''لَایَسۡتَوِی الۡقَاعِدُوۡنَ'' (النساء: ۹۵) والی مشہور آیت کے متعلق نازل ہوئے۔مگر یہی اضافہ جو بقول امام مالکؒ حرف واحد کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس ای حرفی اضافہ کو بھی اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم بند کرنے کا حکم دیا جس وقت وہ نازل ہوا۔(دیکھو بخاری ج:۲،ص:۶۶۰ وغیرہ) امام مالکؒ نے ''حرف واحد'' اس کو ہارون سے ملاقات کے وقت کہا تھا۔(دیکھیے درمنثور ج:۲،ص:۶۴۱ طبع دارالفکر بیروت ۱۹۹۳ء) احتیاط کا اقتضاء یہ بھی تھا کہ لکھوانے پر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قناعت نہیں فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ پڑھوا کر سنتے۔کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:

''فان كان فيه سقط أقامه.'' (مجمع الزوائد ج:۱،ص:۶۰)

ترجمہ: ''اگر کوئی حرف یا نقطہ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درست کراتے۔''

جب یہ سب کام پورا ہوجاتا تب اشاعتِ عام کا حکم دیدیا جاتا تھا پھر جولکھنا

جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے اور زبانی یاد کرنے والے زبانی یاد کرلیا کرتے تھے۔یہی مطلب ہے زید کے ان الفاظ کا:

''ثم أخرج به الى الناس.''

ترجمہ: ''(یعنی جب کتابت وتصحیح وغیرہ کے سارے مراتب ختم ہوجاتے) تب ہم لوگوں میں اس کو نکالتے یعنی شائع کرتے۔''

مگر ظاہر ہے کہ ایسی زیر تصنیف متعدد کتابیں جو قرآنی سورتوں کے طریقہ سے تدریجی طور پر مکمل ہورہی ہوں تو ان کے متعلق یہ خیال کہ وہ مسلسل لکھی جاتیں صحیح نہ ہوگا بلکہ قرآنی سورتوں کی آیتوں کے نزول کا جو حال تھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء ان آیتوں کی حیثیت اس قسم کی یادداشتوں کی تھی جنہیں مصنفین اپنی پیش نظر تصانیف کے لیے پہلے جمع کرتے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان یادداشتوں کو ان کی متعلقہ کتابوں میں ترتیب کے ساتھ درج کرتے چلے جاتے ہیں۔

''ازالۃ الخفاء'' میں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

''مثل آن که امروز منشی منشآتِ خود را یا شاعر قصائد ومقطعات خود را در بیاضها وسفینها در دست جماعة متفرقة گذاشته ازعالم رود.'' (۱)

اوراسی سے ان دو روایتوں کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے جو اس سلسلہ میں پائی جاتی ہیں یعنی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء قرآن اس قسم کی چیزوں سے مثلاً رقاع (چمڑا) لخاف (پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں) کتف (اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی) اور

---

(۱) ازالۃ الخفاء ج:۲،ص:۵

عسیب (کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے) یہ اور اسی کی جیسی چیزوں میں لکھا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ یہ روایت مستدرک حاکم میں پائی جاتی ہے یعنی بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے تھے کہ:-

"کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع." (۱)

ترجمہ: "ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر رقاع (چرمی قطعات) میں قرآن کی تالیف کرتے تھے۔"

دونوں روایتوں سے قرآن کی کتابت کے دو طبعی مرحلوں کا پتہ چلتا ہے یعنی پہلی صورت کے متعلق تو یوں سمجھیے کہ شاعر اپنے مختلف اشعار کو جیسے وہ تیار ہوتے چلے جاتے ہوں چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر نوٹ کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر جب اس کام سے فارغ ہوجاتا ہے تب ان ہی یادداشتوں سے اپنی غزلوں کو مرتب کرتا ہے جس شعر کا جس غزل سے تعلق ہوتا ہے اسی میں اس کو داخل کردیتا ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ کچھ یہی صورت قرآن کے متعلق اختیار کی گئی تھی، البتہ اتنا فرق معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگ کاغذ وغیرہ معمولی چیزوں پر اپنے منتشر اشعار یا خیالات کو ابتداء بطور یادداشت کے لکھ لیا کرتے ہیں۔ گویا شاہ ولی اللہؒ کے الفاظ میں یادداشت کے ان کاغذی پُرزوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر:

"آں کاغذ ہا را آب برسد یا درو ے آتش بگیرد یا حامل آں بمیرد مانندِ اَمس ذاھب نابود گردد." (ازالۃ الخفاء، ج:۲،ص:۵)

(۱) مستدرک حاکم: ج:۲،ص:۶۰۳، نیز یہ حدیث جامع ترمذی (ج:۶،ص:۲۲۳) وغیرہ دیگر کتب حدیث میں بھی ہے۔

ترجمہ: "یعنی اگر پانی کاغذ کے ان ٹکڑوں میں پہنچ جائے یا آگ لگ جائے یا جس کے پاس کاغذی یادداشتیں ہوں وہ مرجائے تو اس طرح ناپید ہوجائیں جیسے گزشتہ کل نابود ہوجاتا ہے۔"

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے وحی کی ان ابتدائی مکتوبہ یادداشتوں کے لکھوانے کے لئے ایسی چیزوں (۱)

(۱) لیکن عام طور پر عجیب بات یہ ہے کہ جن الفاظ میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے ترجمہ میں لاپروائی سے لوگوں نے کام لیا جس سے غلط فہمی پھیل گئی۔ میں پوچھتا ہوں کہ کوئی یوں کہے کہ اسکولوں میں بچے پتھر کے ٹکڑوں پر لکھتے ہیں یا ہندوستان قدیم میں لکھنے کا جو طریقہ تھا اس کو بیان کرتے ہوئے کہا جائے کہ تاڑ واڑ کے پتوں پر لکھا کرتے تھے کیا یہ واقعہ کی صحیح تعبیر ہوگی؟ کیا اسکولوں میں سلیٹ پر لکھنے کا جو رواج ہے پتھر کے ٹکڑے کہنا ان کی صحیح تعبیر ہے۔ اسی طرح ہندوستان قدیم میں تاڑ کے پتوں پر یوں ہی لکھا جاتا تھا جن لوگوں نے خود اپنی آنکھوں سے تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کو نہیں دیکھا ہے صحیح اندازہ شاید ان کو اب بھی واقعہ کی حقیقی نوعیت کا نہیں ہوسکتا لیکن سچی بات یہ ہے کہ کاغذ کے اوراق سے زیادہ بہتر اور محفوظ طریقہ سے تاڑ کے پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں مسلم کتب خانہ میں یہ کتابیں موجود ہیں جو تاڑ کے پتوں پر لکھی گئی ہیں، دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، بجنسہ کچھ اسی قسم کا مغالطہ ان چیزوں کے متعلق بھی عوام میں پھیلا ہوا ہے جن پر قرآنی وحی کی ابتدائی یادداشتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھوایا کرتے تھے۔ مشہور ہوگیا ہے کہ کھجور کی شاخوں بلکہ بعض تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ کھجور کے پتوں یا پتھروں یا ہڈیوں پر قرآن لکھا ہوا تھا۔ سوچنے کی بات تھی کہ کھجور کے پتوں بلکہ اس کی شاخ میں بھی اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے جس پر سطر دو سطر ہی لکھی جاسکے۔ اسی طرح بن گھڑے پتھر یا گری پڑی ہڈیوں پر لکھنا کیا آسان ہے تفصیل کے لئے تو حضرت الاستاذ مولانا گیلانی کی کتاب پڑھیے، خلاصہ یہ ہے کہ حدیثوں میں ادیم، لخاف، کتف، عسیب، اقتاب کے الفاظ آئے ہوئے ہیں۔ ادیم: باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا۔ عرب جو ایک گوشت خور ملک تھا کافی ذخیرہ ادیم کا ان کے یہاں ملتا تھا حتیٰ کہ (جاری ہے)

کا انتخاب فرمایا تھا جن کے متعلق یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ عام حوادث وآفات کا نسبتاً زیادہ مقابلہ کرسکتی ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلافتِ صدیق میں حکومت کی طرف سے زید بن ثابت صحابی رضی اللہ عنہ نے قرآن کا ایک نسخہ جو تیار کیا جس کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی یہ ساری یادداشتیں بالکلیہ جوں کی توں اپنی اصلی حالت میں ان کو مل گئی تھیں۔ مکتوبہ یادداشتوں کے اس انبار سے یہ عجیب بات ہے کہ دس پانچ نہیں بلکہ وہ تین بھی نہیں صرف سورۂ برأت کی آخری حصہ کی ایک یادداشت جس میں صرف دو آیتیں تھیں یہی اور فقط یہی ایک یادداشت والا ٹکڑا اس پورے ذخیرے میں ان کو نہ مل سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سینوں میں اور ان کے ذاتی مکتوبہ قرآنی نسخوں میں یہ آیتیں موجود تھیں بلکہ بطور وظیفہ کے ان کے پڑھنے سے

= خیمہ تک صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ لخاف: ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے تھے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔ سلیٹ اور ان میں فرق گویا صرف رنگ کا ہوتا تھا اسی طرح اونٹ کے مونڈھے کے پاس کی گول ہڈی طشتری کی طرح بن جاتی ہے۔ اس کو خاص طریقے سے تراش کر نکالا جاتا تھا۔ کاٹنے کے عمل میں کبھی شگاف وغیرہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ رہ جاتا تھا (دیکھو مسند احمد کی روایت از زید بن ثابت صحابی رضی اللہ عنہ ص:١٥١) اسی لئے "قطعة من الكتف" بھی اسی کو کہتے تھے (مجمع الزوائد ج:١ ص:٦٠) عسیب: کھجور کی شاخ کو نہیں بلکہ پام قسم کے تمام درختوں کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے اس میں کافی کشادگی پیدا ہوجاتی ہے۔ تاڑ، ناریل کی شاخوں میں ان کو آپ دیکھ سکتے ہیں عرب کی کھجور کی شاخوں کا یہ حصہ قریب قریب ہندوستان کے ناریل کی شاخوں کے اس حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ اس حصہ کو شاخ سے جدا کرلیا جاتا تھا اور ان ہی ٹکڑوں کو خشک کر کے ان پر لکھتے تھے۔ اقتاب: قتب کی جمع ہے، اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی پھٹیاں جو استعمال ہوتی ہیں ان کو کہتے ہیں۔ یہ چوڑے چوڑے پتلے پتلے تختوں کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ تازہ لکڑی کے تختے تازگی کی وجہ سے عموماً کھردرے ہوتے ہیں اور پرانے کجاووں (جاری ہے)

معلوم ہوتا ہے کہ عام رواج بھی تھا۔(١)

بہرحال اس وقت تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسی ایک ٹکڑے کے سوا جس میں سورۂ برأت کی دو مشہور وِردی آیتیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی تمام ابتدائی یادداشتوں کا خلافتِ صدیقی کے زمانہ میں مل جانا خود بھی ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں پر ان کے لکھنے کا انتظام کیا گیا تھا جو اتنی طویل مدت یعنی چوبیس پچیس سال تک حوادث وآفات سے محفوظ رہ سکیں اس لئے کہ نزولِ وحی کی ابتداء سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اس عہد تک جس میں قرآن کے متعلق

= میں امتداد زمانہ سے ان کا کھردرا پن مٹ جاتا تھا، لکھنے کے کام کے بآسانی چیرنے سے وہ بن جاتے تھے۔ بتایا جائے کہ ان تفصیلات سے جو ناواقف ہوگا وہ ان عام پھیلے ہوئے الفاظ سے اگر غلط فہمی کا شکار ہوجائے تو کیا بعید ہے۔ مولٰنا گیلانی کی کتاب میں مبسوط بحث ان کتابی مواد پر کی گئی ہے۔ میں نے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا ہے۔١٢

(١) ابوداؤد (ج:٥ ص:١١٠) وغیرہ صحاح ستہ کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اس باب میں جو مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ برأت کی آخر کی ان آیتوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ صبح وشام جو آدمی ان کی تلاوت سات (٧) مرتبہ کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا اور دین کی مشکلات اس کی برکت سے حل کردیں گے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن آیتوں کی یہ خاصیت بیان کی ہو، کون ہوگا جو معلوم ہوجانے کے بعد ان سے مستفید نہ ہوتا ہوگا۔ اس سلسلہ میں بعض عملی تجربات بھی لوگوں کو صحابہ ہی کے زمانے میں ہوئے تھے۔ محمد بن کعب نے اس فوجی مہم کا ذکر کرتے ہوئے جس نے روم کے علاقہ پر حملہ کیا تھا یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک فوجی سپاہی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، راستہ میں بے چارے اٹک گئے، اتنے میں کسی نے ان کو سورۂ برأت کے انہی الفاظ کا وظیفہ بتایا اور کہا کہ اسی کو پڑھ کر ٹوٹے ہوئے مقام کو جھاڑا کرو، لکھا ہے کہ عمل سے اس کی تصدیق ہوئی، یعنی ٹانگ ان کی درست ہوگئی اور اتنی درست ہوگئی کہ گھوڑے پر سوار ہوکر فوج میں پھر آکر مل گئے۔ (دیکھو درمنثور ج:۴ ص:۳۳۴)

حکومت کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کام کیا، اتنی ہی مدت میں ہونا چاہیے۔

بہرحال ایامِ جاہلیت کی تاریخ سے جو جاہل ہیں ان کا یہ خیال قطعاً بے بنیاد ہے کہ لکھنے کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی ابتدائی یادداشتوں کو اس قسم کی چیزوں یعنی چمڑے یا لخاف (سنگی باریک تختیوں)، عسیب (شاخ خرما کی جڑ کا عریض حصہ)، کتف (شانہ شتر)، وغیرہ پر لکھوایا کرتے تھے، یقیناً یہ وہی کہہ سکتا ہے جسے جاہلی عرب کے صحیح حالات کا علم نہیں ہے، تفصیل تو آگے آرہی ہے کچھ نہیں تو ابھی مستدرک حاکم کی جو روایت گذری جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کی کتابت کے پہلے مرحلہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھ کر رقاع میں صحابہ قرآن کو جمع کرتے تھے اور رقاع جیسا کہ معلوم ہے رقعہ کی جمع ہے، یہ چمڑے کے خاص قسم کے ٹکڑے ہوتے تھے جو لکھنے ہی کے لئے تیار کیے جاتے تھے گویا پارچمنٹ (PARCHMENT) جسے عربی میں رق کہتے ہیں اسی کی تعبیر رقاع کے لفظ سے کی گئی ہے یا پارچمنٹ ہی کی کسی خاص قسم کا نام رقاع تھا۔

آخر اُس وقت رقاع (۱) سے جیسے کام لیا جاتا تھا۔ ابتدائی کتابت کے وقت بھی

(۱) لغت کی کتاب "مجمع البحار" میں "رقاع" کی تحقیق کرتے ہوئے ایک دوسری حدیث بھی نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ آئیں گے "وعلی رقبته رقاع تخفق" پھر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے " أرادبالرقاع ماعليه من الحقوق المكتوبه فى الرقاع" جس کا مطلب یہی ہوا کہ دین اور قرض وغیرہ جیسے مطالبات ادا کیے بغیر مرجائیں گے قیامت کے دن ان مطالبات کے وثائق کو اپنی اپنی گردنوں میں باندھے نمودار ہوں گے اور مطالبات کے یہ وثائق رقاع میں لکھے ہوں گے جس سے معلوم ہوا کہ "رقاع" کا یہ لفظ جو رقعہ کی جمع ہے اس کے متعلق یہ (جاری ہے)

کیا یہی رقاع نہیں مل سکتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ قرآن ہی میں لوگ یہود کے متعلق:

"كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً." (الجمعۃ: ۵)

ترجمہ: "اُن کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابیں لادے ہو۔"

اور ان جیسی دوسری آیتیں پڑھتے ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ بھی باور کیے جاتے ہیں کہ عرب کتابی ساز و سامان سے بالکل خالی تھا۔ یہودیوں کو تو لکھنے کے لیے اتنا سامان مل سکتا تھا کہ گدھے بن کر اس کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد سکتے تھے لیکن پیغمبر کو قرآن کے چند اوراق کے لئے وہی چیزیں نہیں مل سکتی تھیں جن پر بارِ خر کے برابر یہ کتابیں لکھا کرتے تھے۔

"مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ" (القلم: ۳۶)

واقعہ یہ ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت کی تاریخ سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس ملک کے شمال وجنوب (۱) میں کتب خانوں کے مختلف مراکز پائے جاتے تھے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، بہرحال ان تاریخی روایات کی روشنی میں قرآن کے اجمالی

= بات کہ وثائق اس پر لکھے جاتے تھے۔ عرب کا عام دستور تھا گویا کاغذ کے لفظ کا جو حال اس وقت اردو میں ہے بلکہ "رقعہ" کا لفظ اردو میں بھی تو آج تک لکھی ہوئی تحریروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ (دیکھو مجمع البحار ج: ۲، ص: ۳۶۴)

(۱) یمن میں یہودی اور عیسائی مذہب پھیلا ہوا تھا اور بڑے بڑے چرچ یہاں قائم تھے، جن میں ان مذاہب کا لٹریچر اور اس کی بے شمار کتابیں پائی جاتی تھیں، نہ صرف گرجوں میں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر بھی علماء یہود ونصاریٰ کے پاس کتابوں کا کافی ذخیرہ رہتا تھا۔ کعب احبار ہی کا حال طبقات ابن سعد (ج: ۷، ص: ۴۴۵) وغیرہ میں پڑھیے جس سے میرے اس بیان کی توثیق ہوگی اسی طرح شمال عرب میں خیبر یہود کا مرکز تھا جہاں ان کے دین کی کتابیں بکثرت ملتی تھیں خود مدینہ منورہ کے قریب مقام "تف" میں یہودیوں کا بیت المدارس یا مدرسہ تھا جس میں تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابیں بھی تھیں۔ ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

بیان کی یہ تشریح پیدا ہوتی ہے کہ قرآن کی ہر آیت کو ایک تو اس وقت لکھ لیا جاتا تھا جس وقت وہ نازل ہوتی تھی پھر ہر ہر سورت مرتب ہونے کے بعد جس حد تک پہنچ جاتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں کو لکھوا دیتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر قرآن لکھنے کے جس کام کا ذکر مستدرک حاکم والی روایت میں کیا گیا ہے اس میں کتابت قرآن کی اسی دوسری منزل کا پتہ ان الفاظ میں جو دیا گیا ہے کہ وہ ''ہم تالیف کرتے تھے'' صحابہ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف سورتوں میں جدید اضافے وحی کے ذریعہ جو ہوتے رہتے تھے ان اضافوں کو متعلقہ سورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کے سامنے بیٹھ کر جوڑتے تھے اور یوں تدریجاً قرآن کی ان سورتوں کے وہ نسخے جو صحابہ کے پاس جمع ہوتے چلے جاتے تھے مکمل ہوتے رہتے رہے۔(۱)

(۱) مستدرک حاکم کی مذکورہ بالا روایت یعنی صحابی کا بیان ''**کنا جلوسا عند رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم نؤلف القران من الرقاع**'' (ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھ کر قرآن کو رقاع میں تالیف کرتے تھے) خود اسی میں تالیف کرنے کا جو ذکر ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف نقل نہیں کرتے تھے بلکہ جن جن صورتوں کی متعلقہ آیتیں اس وقت تک نازل ہو چکی ہوتیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی سورتوں کے ان مقامات پر ترتیب دیکر لکھا کرتے تھے جہاں پر ان کو ہونا چاہیے تھا، بیہقی نے بھی تالیف کا مطلب یہی لیا ہے، لکھا ہے کہ ''**المراد تألیف ما نزل من الأیات المقرونة فی سورها وجمعها فیها باشارة النبی صلی اللہ علیه وسلم**'' (حاشیہ بخاری ج:۲،ص:۷۴۵، مطبوعہ ہند) جس کا حاصل وہ ہے جو میں نے عرض کیا۔ اس کثرت سے صحابیوں نے براہ راست قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا تھا کہ عہد عثمانی میں جب حکومت کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس جس کے پاس پورا قرآن یا اس کی سورتیں ہوں تو ان کو لے کر حاضر ہوں تو بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں نے لا لا کر جمع کرنا شروع کیا''**فکان الرجل یجیٔ** (جاری ہے)

پس یہی نہیں کہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین صرف زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، بلکہ جو لکھنا جانتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر جیسے جیسے سورتیں مکمل ہوتی چلی جاتی تھیں ان کی نقل بھی لیتے چلے جاتے تھے اور آنحضرت کی منشاء کے مطابق ان کو مرتب کرتے جاتے تھے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا سے جس وقت تشریف لے گئے تو صحابہ کے سینوں میں بھی اور ان کے سفینوں میں بھی قرآن محفوظ تھا۔ سینوں کی حفاظت کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ عہدِ نبوت ہی میں بیر معونہ کا واقعہ پیش آیا تو جیسا کہ بخاری میں ہے کہ شہید ہونے والوں کی تعداد ستر (۷۰) کے قریب تھی۔ دھوکہ دے کر کفار نے ان کو قتل کر دیا تھا اور یہ سارے کے سارے قراء یعنی حافظِ قرآن تھے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کل ایک سال بعد عرب کی ایک مقامی یورش کو دبانے کے لئے عہد صدیقی میں یمامہ (نجد) فوجی دستہ بھیجا گیا تھا لیکن اتفاقاً کثیر تعداد شہید ہوگئی، اس میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کے حفاظ کی تعداد

= **بالورقة والادیم فیه القرآن**'' (یعنی لوگ ورق اور چمڑے میں لکھے ہوئے قرآن کے ساتھ حاضر ہوئے) اسی میں یہ بھی ہے کہ ''**حتیٰ جمع من ذلک کثرة**'' (یعنی بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا) بہرحال کہنے کی بات یہ ہے کہ جب یہ سارا ذخیرہ جمع ہوگیا تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ روایت ہے'' **فدعاهم رجلا رجلا فناشدهم أسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وهو أملّه علیک فیقول نعم** (کنز العمال ج:۲، ص:۵۱) یعنی ایک ایک آدمی (یعنی صحابی کو بلاتے اور قسم دے دیکر فرماتے کہ واقعی تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست سن کر لکھا ہے۔ صحابی کہتے کہ ہاں! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآنی سورتوں کی ایسی نقلیں کتنی کثرت سے صحابہ میں پھیل چکی تھیں جو براہِ راست خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہوئی تھیں۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

سات سو (۷۰۰) تھی جیسا کہ بخاری کے حاشیہ میں ہے:۔

"کان عدة من قتل من القرآء سبعمائة." (ج:۲،ص:۷۴۵)

ترجمہ: **"قرآن کے حفاظ اس جنگ میں جتنے شہید ہوئے تھے ان کی تعداد سات سو تھی۔"(۱)**

ایک معمولی مقامی مہم میں شہید ہونے والوں کے اندر خیال تو کیجئے کہ جب سات سات سو (۷۰۰) صحابی ہوتے تھے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ میں کتنی زیادہ تعداد حفاظ کی پائی جاتی تھی اور یہی حال مکتوبہ نسخوں کی کثرت کا معلوم ہوتا ہے جو ان ہی صحابیوں کے پاس موجود تھے۔ مکہ کے ابتدائی زمانہ ہی میں کون نہیں جانتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام میں اسی وجہ سے داخل ہوئے تھے کہ ان کی بہن قرآن پڑھ رہی تھیں۔ انہوں

(۱) اس تعداد پر تعجب نہ کرنا چاہیے عام تاریخوں مثلاً طبری وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار اور کئی سو آدمی مسلمانوں کی فوج کے یمامہ کی اسی مہم میں شہید ہوئے تھے، شہداء میں بڑے بڑے لوگ مثلاً سالم مولیٰ ابی حذیفہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے حقیقی بھائی زید بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس جنگ میں کام آئے۔ قرآن کے متعلق حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ کو خاص خصوصیت صحابہ میں حاصل تھی۔ بخاری (ج:۳،ص:۲۹۱) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن چار صحابیوں سے قرآن پڑھنے کا حکم عام مسلمانوں کو دیا کرتے تھے، ان میں ایک سالم ہی تھے، طبری وغیرہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سالم کے ساتھ جو فوجی دستہ تھا وہ اہل القرآن کا فوجی دستہ سمجھا جاتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے سالم ہی سے قرآن پڑھا تھا، اور استاذ کے ساتھ سب ہی شہید ہوئے تھے، حضرت سالم کہتے بھی تھے کہ ہم قرآن والے لوگ ہیں پیچھے ہٹ نہیں سکتے اور واقعہ یہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو قرآن یاد کراتے تھے، خود صحابہ پر بھی قرآن کے سیکھنے پڑھنے اور یاد کرنے کا جو بے پناہ جذبہ مسلط (جاری ہے)

نے اس کو چھیننا چاہا تو بہن نے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں۔(۱) کچھ نہیں تو ابتداءِ اسلام کا یہی ایک واقعہ اس عامیانہ خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ ابتدائی

= تھا اور اسی کے ساتھ اس کا بھی اگر خیال کیا جائے کہ امامت سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک امتیاز اور ترجیح کا واحد معیار عہد نبوت میں صرف یہ تھا کہ قرآن جس کو زیادہ یاد ہو وہی امام بنایا جاتا تھا اور شہیدوں میں دفن کے وقت اسی کو پہلے دفن کیا جاتا تھا جو قرآن کے یاد کرنے میں زیادہ آگے ہوتا تھا۔ عرب کا دماغ عام مشغلوں سے اس وقت خالی تھا، علمی پیاس اب میں جب پیدا ہوئی تو سب سے پہلے تشنگی بجھانے کے لئے ان کو قرآن ہی ملا، صحابہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن ان کے سینوں میں اس طرح جوش مارتا رہتا تھا جیسے کھولتی ہنڈیا جوش مارتی ہے جہاں کہیں ایک جگہ چند صحابی جمع ہوجاتے تھے تو لوگوں کا بیان ہے کہ دوی کدوی النحل (شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ) کی آواز گونجنے لگتی تھی، یعنی قرآن کا ورد ہر ایک شروع کر دیتا تھا ان حالات میں اس پر کیوں تعجب کیجئے اگر یمامہ کی لڑائی میں سات سو قرآن کے حفاظ شہید ہوگئے۔ واقعہ کی اہمیت ہی کا تقاضا تو ہوا جو اس عظیم سانحہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرآنی سورتوں کی شیرازہ بندی پر اصرار کے ساتھ آمادہ کیا۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

(۱) سیرت ابن ہشام میں ہے کہ بہن کی زدوکوب سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبیعت میں شرمندگی سی محسوس ہوئی اور بہن سے بولے **"أعطینی الصحیفة التی سمعتکم تقرؤن انفا"** (ص:۲۱۷، ج:۱، بر روض الأنف) یعنی جو صحیفہ (کتاب) تم لوگوں سے میں نے سنا پڑھتے ہوئے مجھے دو۔ اس پر ان کی بہن نے کہا "تم ناپاک ہو ایسی حالت میں اس کو چھو نہیں سکتے۔" **"فاغتسل فأعطته الصحیفة"** تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کیا اور ان کی بہن نے صحیفہ ان کو دیا۔ صحیفہ دینے کے اس قصہ کا ذکر علاوہ سیرت کی کتابوں کے دارقطنی کی سنن میں بھی ہے۔ البتہ بجائے غسل کے اس میں وضو کرنے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بہرحال **"ثم أخذ الصحیفة"** کے الفاظ اس روایت میں بھی ہیں۔ "روض الأنف" میں لکھا ہے کہ اس صحیفہ میں صرف ایک سورۂ طٰہٰ ہی نہیں تھی بلکہ طٰہٰ کے سوا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ **"اذا الشمس کورت"** کی سورۃ بھی اس صحیفہ میں تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن سے مانگ کر پڑھا تھا۔ (دیکھو ج:۱،ص:۲۱۷، روض الأنف سہیلی)

یادداشتوں کے سواء قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک کتابی شکل حاصل نہ کرسکا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان عورتوں تک کے پاس قرآن کی نقلیں مکہ معظّمہ ہی میں جب پائی جاتی تھیں تو زمانہ جیسے آگے کی طرف بڑھا کوئی وجہ ہوسکتی تھی کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی نقل نہ حاصل کرتے ہوں، ذرا خیال تو کیجئے کہ بخاری (ج:۱، ص:۴۲۰) وغیرہ میں لوگ یہ بھی پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابیوں کو منع فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کو لے کر دشمن کے علاقہ میں نہ جایا کرو، اگر مکتوبہ شکل میں قرآن کے نسخے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس موجود ہی نہ تھے تو اس حکم کے معنی کیا ہوں گے اسی طرح روایتوں میں ہے کہ ناظرہ (۱) یعنی دیکھ کر قرآن کے پڑھنے کا ثواب رسول اللہ فرماتے تھے کہ زیادہ ہے، کیا اس حکم کی تعمیل مکتوبہ قرآن کے بغیر ممکن تھی۔ پس واقعہ یہی ہے جیسا کہ صحابہ خود ہی بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر وہ قرآن کی نقل حاصل کیا کرتے تھے اور یوں بکثرت قرآنی سورتوں کی نقلیں صحابہ

(۱) مثلاً حدیثوں میں ہے کہ ناظرہ دیکھ کر قرآن پڑھنے کا درجہ اسی قدر بلند ہے جتنا کہ فرض نماز کو نفل نماز پر فضیلت حاصل ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ رسول کو جو دوست رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ قرآن کو مصحف میں پڑھے، اور یہ روایتیں تو صحاح کی عام کتابوں میں پائی جاتی ہیں مگر دارمی (۱) کی وہ تاریخی روایت جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری خطبہ میں جب اس مقام پر پہنچے یعنی فرمارہے تھے کہ لوگوں قبل اس کے کہ علم اٹھالیا جائے اس کو حاصل کرو اس پر ایک اعرابی نے کہا کہ کیا علم اٹھالیا جائے گا حالانکہ "المصاحف" یعنی مکتوبہ قرآن کے نسخے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیا اس سے زیادہ صریح شہادت اس بات کی مل سکتی ہے کہ عہدِ نبوت میں گھر گھر قرآن کے نسخے پھیل چکے تھے اس سلسلے میں چاہا جائے تو اور بھی بہت سی روایتیں پیش ہوسکتی ہیں۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

(۱) ملاحظہ ہو فتح المنان شرح دارمی ج:۲، ص:۳۵۸، نیز یہ حدیث جامع ترمذی ج:۴، ص:۳۹۱ وغیرہ کتب حدیث میں بھی ہے۔ عبدالحلیم

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس موجود تھیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ قرآن کی یہ سورتیں جن کی حیثیت مستقل رسالوں اور کتابوں کی تھی ان سب کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا طریقہ رسول اللہ کے عہد میں مروج نہیں ہوا تھا بلکہ ایک ہی مصنف کی مختلف کتابیں الگ الگ جلدوں کی شکل میں جیسے آج کل چھپی ہوئی ملتی ہیں سمجھنا چاہیے کہ یہی حال گویا عموماً قرآن کی ان سورتوں کا تھا۔ اگرچہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی طور پر ایک سے زائد صحابیوں نے یہ کام بھی کرلیا تھا، یعنی ایک ہی سائز پر لکھ کر ایک ہی جلد کی صورت میں قرآن کو جمع کرلیا تھا۔ لیکن اس کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔ (۱) آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عہدِ صدیقی میں قرآن کی جو

(۱) میرا اشارہ بخاری (ج:۲، ص:۷۴۸) وغیرہ کی اس روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن کو چار آدمیوں نے جمع کیا اور یہ سب انصار کے تھے، یعنی ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوزید اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم، عام طور پر جمع کرنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ زبانی یاد کیا تھا مگر بیر معونہ میں ستر (۷۰) صحابی جو شہید ہوئے تھے ان کی طرف " جمعوا القرآن " (یعنی انہوں نے قرآن کو جمع کیا تھا) یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں۔ ابن شہاب زہریؒ بجائے "جمعوا" کے "وعوہ" کا لفظ اس موقع پر استعمال کرتے تھے۔ یعنی زبانی یاد کیا تھا ان لوگوں نے قرآن کو (کنز العمال، ج:۲، ص:۵۰ برحاشیہ مسند احمد) پھر بخاری (ج:۲، ص:۷۴۸) میں جن چار (۴) انصاری صحابیوں کی طرف جمع قرآن کی خدمت کو جو منسوب کیا گیا ہے یقیناً اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ جمع قرآن کی اس خدمت کی نوعیت یاد کرنے سے یعنی سینہ میں جمع کرنے سے مختلف تھی، اور وہ یہی ہوسکتی ہے کہ بجائے سینوں کے مانا جائے کہ ان چار انصاری بزرگوں کے پورے قرآن کو یعنی اس کی ہر ہر سورت کو ایک ہی سائز کے اوراق پر لکھنے کی امتیازی خدمت انجام دی تھی جس کی تعبیر جمع کرنے کے لفظ سے کی گئی ہے، بلکہ چار صحابیوں کے جمع کرنے کا ذکر جس روایت میں کیا گیا ہے اسی روایت کے دوسرے طریقوں کے جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کی یہ خدمت انہیں چار تک راوی (جاری ہے)

مشہور خدمت انجام دی گئی ہے اس کا تعلق اسی واقعہ سے ہے، میرا اشارہ بخاری (ج:۲،ص:۷۴۵) وغیرہ کی اسی مشہور روایت کی طرف ہے جس میں بیان کیا گیا

= نے جو محدود کی ہے اس کا تعلق انصار سے ہے یعنی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھ کر سب کو ایک جگہ جمع کرنے کا کام انصاری صحابیوں میں سے ان چار نے انجام دیا تھا۔ محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے کنز العمال (ج:۲،ص:۴۷) ہی میں جو روایت ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں ''**جمع القرآن فی زمان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خمسة من الانصار**'' (یعنی انصار کے پانچ آدمیوں کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں انہوں نے قرآن جمع کیا تھا) جس سے معلوم ہوا کہ انصار میں بھی جمع کرنے والوں کی تعداد چار سے زیادہ تھی، اور یہ بات تو واضح ہی ہوگئی کہ اس قصہ کا تعلق صرف انصار کے طبقہ سے تھا نیز طبرانی کے حوالہ سے کنز العمال (ج:۲،ص:۵۲) ہی میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ انصار میں سے ''مجمع بن جاریہ'' نے بھی قرآن جمع کیا تھا بجز دو یا تین سورتوں کے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصنف کی جیسے کل کتابیں لوگ جمع کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن اکثروں کے پاس کل تصنیفات نہیں ہوتیں، عہدِ نبوت میں عام صحابہ کا قرآنی سورتوں کے متعلق یہی حال تھا، کنز العمال میں ابن داؤد کی کتاب ''المصاحف'' کے حوالہ سے صحابہ کے متعلق یہ الفاظ صراحۃً بھی منقول ہیں ''**کانوا کتبوا ذلک فی الصحف والالواح**'' (یعنی صحابہ نے قرآن کو صحیفوں اور تقطیعوں میں لکھ لیا تھا) (ج:۲،ص:۴۵، بر مسند احمد۔)

میں لوگوں سے کیا کہوں مسند احمد* (ج:۱،ص:۲۵) ہی میں اس واقعہ کا تذکرہ جو ملتا ہے کہ قیس بن مروان نامی ایک صاحب کوفہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آکر عرض کیا کہ ایک شخص کو کوفہ میں چھوڑ کر آیا ہوں جو قرآن کو زبانی لکھواتا ہے، راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر غصے سے بے خود ہوگئے اور غصے میں فرما رہے تھے: ارے یہ کون شخص ہے جو ایسی حرکت کرتا ہے؟ قیس نے کہا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہی کرتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا نام سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور فرمایا کہ ''خیر قرون کے جاننے والوں میں میں نہیں جانتا کہ ان سے بھی بڑا عالم کوئی رہ گیا ہے۔'' میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس روایت کے بعد یہ خیال کہ عام طور پر قرآن کو (جاری ہے)

ہے کہ یمامہ میں حفاظِ قرآن کے شہداء کی غیر معمولی کثرت کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی کاتبِ وحی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ایک نسخہ قرآن کا وہ تیار کریں۔

نہ سمجھنے والوں نے خدا جانے اس روایت سے کیا کچھ سمجھ لیا ہے اور عجیب وغریب نتائج پیدا کر لیے۔ بعض اس روایت کو پیش کر کے مدعی ہوگئے کہ قرآن نے کتابی قالب عہد صدیقی ہی میں اختیار کیا اور نہ اس سے پہلے قرآن کی حیثیت زبانی یادداشتوں کی سی تھی۔ مگر جو کچھ اب تک عرض کیا جاچکا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد کوئی صاحبِ فہم لمحہ بھر کے لیے کیا اس مغالطہ میں مبتلا رہ سکتا ہے؟ لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ فقط لکھوانے ہی کا اگر قصہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو خود لکھنا جانتے تھے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس فرمان کے نافذ کرنے میں کش مکش کا اظہار کیا مگر بعد کو وہ راضی ہوگئے، انہوں نے کہا تھا کہ میں اس کام کو کیسے کروں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ بخاری (ج:۲،ص:۷۴۵) میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں:۔

''کیف تفعل شیئا لم یفعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.''

= زبانی لکھوانے کی ممانعت تھی اور یہ کہ جو بھی قرآن لکھتا تھا کسی مکتوبہ نسخے سے نقل کرتا تھا، اگر قائم کیا جائے تو اس کے سوا کیا کوئی دوسرا احتمال پیدا ہوتا ہے۔ ۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

* مسند احمد کے علاوہ یہ قصہ ''سیر أعلام النبلاء'' (ج:۱،ص:۴۷۶)، اور ''حلیۃ الاولیاء (ج:۱،ص:۱۲۴) میں بھی ہے۔ عبدالحلیم

ترجمہ: ”یعنی تو اس کام کو کیسے کر رہا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔“

کیسی عجیب بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو قاعدہ تھا کہ اترنے کے ساتھ ہی قرآن کی ہر آیت کو لکھوا دیتے تھے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کام کو نہیں کیا اس کام کو کیسے کروں“ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے اگر اس قصہ کا تعلق قرآن اور قرآنی سورتوں کے صرف لکھوانے اور قلمبند کرانے سے ہوتا جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

عہدِ صدیقی میں قرآنی خدمت کی صحیح نوعیت:

پس اصل واقعہ وہی ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کروانے کا کام اور وہ بھی حکومت کی طرف سے اس کام کو انجام دلانا یہی ایسا کام تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں ہو پایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی خدمت کو حکومت کی طرف سے انجام دلانے کا مطالبہ کر رہے تھے، چاہتے تھے کہ خلافت اور حکومت اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنی نگرانی میں اس کی تکمیل کرائے۔ بلاشبہ یہ ایک نیا اقدام تھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس اقدام کے متعلق اگر تردد ہوا تو اس کی یقیناً گنجائش تھی، لیکن بعد کو خود ان کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ بجائے متفرق رسالوں کی صورت میں رہنے کے یہ زیادہ مناسب ہے کہ تمام قرآنی سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں سب کو مجلد کرا دیا جائے۔ پھر جیسا کہ سب جانتے ہیں بخاری کی اسی روایت میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکومت کی طرف سے اس خدمت کے انجام دینے

کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انتخاب فرمایا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کام کو پورا کیا۔(۱) کام کی رپورٹ کرتے ہوئے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے وہی باتیں کہیں جو آج بھی کتابوں کے نقل کرنے والے خصوصاً قرآن جیسی اہم کتابوں کے لکھنے اور چھاپنے والے عموماً کہا کرتے ہیں۔ یعنی مختلف نسخوں کو بھی انہوں نے لکھتے وقت پیشِ نظر رکھا۔ اسی سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی ابتدائی یادداشتیں جو رقاع، عسیب، لخاف وغیرہ پر تھیں ان کو بھی انہوں نے اپنے سامنے لکھتے وقت رکھ لیا تھا، نیز ہر آیت کی تصحیح دو دو حافظوں سے بھی کرتے چلے جاتے تھے، البتہ وہی سورۂ برأت کی آخری دو آیتیں ان کے متعلق رپورٹ میں انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھائی ہوئی یادداشتوں میں وہ یادداشت نہ ملی جس میں یہ آیتیں لکھی ہوئی تھیں اسی کے ساتھ یہ بھی بیان کیا کہ دو حافظوں کی تصحیح کی جو شرط تھی اس کی پابندی بھی ان آیتوں کے متعلق میں نے نہیں کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست ان کو میں سُنتا رہا اور ایک صحابی جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) امام شہاب زہریؒ سے اور شہاب زہری عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے سالمؒ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کرتے تھے کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ”القراطیس“ پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا، غالباً ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے (دیکھو اتقان ص:۵۹، ج:۱) ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو ”رَبعه“ بھی کہتے تھے (دیکھو اتقان ج:۱، ص:۵۹) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طول وعرض ان اوراق کا متساوی تھا۔ ”رَبعَة“ جس کا ترجمہ ”چوکھونٹ“ کیا جا سکتا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

دوشہادتوں کے متساوی قرار دیا تھا (۱) یعنی خزیمہ بن ثابت (۲) انصاری رضی اللہ عنہ کی تصحیح کو کافی سمجھا جس کی وجہ غالباً وہی کہ سورۂ برأت کی ان آیتوں کو بطور وظیفہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیوں کو پڑھنے کا عام حکم دے رکھا تھا، اسی لئے عام طور پر دونوں آیتیں جانی پہچانی تھیں۔

(۱) واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک بدوی جس کا نام ''سواء بن قیس المحاربی'' تھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گھوڑے کی فروخت کا معاملہ کیا مگر بعد کو مکر گیا اور بولا کہ معاملہ کس کے سامنے ہوا؟ واقعہ یہ تھا کہ معاملہ کے وقت کوئی دوسرا موجود نہ تھا خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر کہا کہ بیشک معاملہ ہوا تھا! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم کب موجود تھے جو گواہی دے رہے ہو؟ خزیمہ نے کہا کہ آپ کی رسالت کو جب ہم حق سمجھتے ہیں تو بھلا گھوڑے کے معاملہ میں آپ کوئی خلاف واقعہ دعویٰ فرما سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقعہ پر فیصلہ فرمایا کہ خزیمہ جس کی موافقت یا مخالفت میں گواہی دیں ان کی گواہی کافی قرار دی جائے گی۔ (اسد الغابہ ج:۲ ص:۱۱۴)

(۲) ان صحابی کا نام خزیمہ تھا یا ابوخزیمہ، بخاری (ج:۲ ص:۷۴۶) تک کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راویوں میں سے کسی راوی کو ان کا نام خزیمہ یاد رہا اور کسی کو ابوخزیمہ، اگرچہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ خزیمہ نام بتانے والے صحت سے زیادہ قریب ہیں، ان روایتوں میں ایک اختلاف یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق عہدِ صدیقی کی قرآنی خدمت سے تھا یا یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت نے جو کمیٹی بٹھائی تھی اس وقت یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر ظاہر ہے کہ عہدِ عثمانی میں اس واقعہ کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی۔؟ عہدِ صدیقی میں قرآن کے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی ہوچکی تھی، عہدِ عثمانی میں تو صرف عہدِ صدیقی کے اسی مرتبہ نسخہ کی نقل کی گئی تھی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن آیتوں کے متعلق زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا بیان دیا تھا۔ روایت کرنے والے خود اُن آیتوں کی تعیین میں کچھ مبتلائے اشتباہ ہوگئے تھے، بعض تو وہی سورۂ توبہ کا نام لیتے تھے اور بعض کہتے تھے کہ سورۂ احزاب کی ''رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ'' (الأحزاب: ۲۳) والی آیت تھی اور غالب قرینہ یہی ہے کہ برأت ہی والی آیت تھی کیونکہ عام طور پر بطور وظیفہ کے ان ہی دو (جاری ہے)

بہرحال حکومت کی جانب سے ایک ہی تقطیع کے اوراق پر تمام قرآنی سورتوں کے لکھوانے اور سب کو ایک ہی جلد میں مجلد کرانے کا مرحلہ تو عہدِ صدیقی ہی میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال بعد ہی پورا ہوچکا تھا، علامہ قسطلانی شارح بخاری کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے کہ:-

''قد كان القرأن كله مكتوباً في عهده صلى الله عليه وسلم لكنه غير مجموع في موضع واحد'' (ج:۲ ص:۲۸۴، التراتيب الادارية، الكتاني)

ترجمہ: ''قرآن کل کا کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھا جاچکا

= آیتوں کے پڑھنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اسی لئے ہر خاص وعام کے یاد ہونے کی وجہ سے زیادہ تفتیش وتلاش کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، بلکہ روایتوں کے مختلف الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو ان سے واقعہ کی اصل صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی یادداشتوں میں سے صرف یہی ایک ٹکڑا جس میں توبہ کی یہ دونوں آیتیں تھیں زید کو نہ مل سکا تھا وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ ٹکڑا مفقود تھا ''فالتمسناها فوجدناها عند خزيمة'' (پھر ہم لوگوں نے اس کو ڈھونڈھنا شروع کیا تو خزیمہ کے پاس وہی گمشدہ رقعہ یا ٹکڑہ مل گیا) بجائے مفرد صیغے کے ''فالتمسناها (ہم نے ڈھونڈھا) فوجدناها'' (پھر ہم نے پایا) جمع کا صیغہ حضرت نے جو استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے صحابی تلاش میں بھی اور اس ٹکڑے کے پانے میں بھی شریک تھے۔ خزیمہ کے پاس یہ رقعہ یا ٹکڑا کیسے پہنچ گیا تھا، ممکن ہے کہ نقل کرنے یا کسی دوسری غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خزیمہ مانگ کر لے گئے اور واپسی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی یا کسی اور وجہ سے واپس کرنے کا موقعہ ان کو نہ مل سکا۔۱۲

تھا، البتہ ایک جگہ ساری سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا (یعنی ایک جلد سازی اور شیرازہ بندی ان سورتوں کی نہیں ہوئی تھی۔''

حارث محاسبی نے جو امام حنبلؒ کے معاصر ہیں اپنی کتاب ''فہم السنن'' میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں قرآن کی یادداشتوں کا جو مجموعہ تھا:

''وكان القرأن بمنزلة أوراق وجدت في بيت رسول الله صلى الله عليه وسلم فيها منتشراً فجمعها جامع وربطها بخيط.''

(اتقان، ج:۱،ص:۵۸)

ترجمہ: ''اسی میں قرآنی سورتیں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں (ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جامع (یعنی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگہ سے سب کی شیرازہ بندی کی۔''

اور یہی کام یعنی ایک جلد میں مجلد کرانے کا کام عہدِ صدیقی میں انجام پایا لیکن دوسروں کو بھی اس کی تقلید پر یعنی ساری سورتوں کو ایک ہی تقطیع پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرائیں اور سورتوں کی جلد بندی میں جو ترتیب رکھی گئی تھی اس کی پابندی کریں اس پر لوگوں کو مجبور نہیں کیا گیا تھا، بلکہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو مختلف سائز کے اوراق پر جیسے لوگ چھاپتے ہیں اور کسی خاص ترتیب کی پابندی کے بغیر جس کے جی میں جس طرح آتا ہے ان کی جلد بندھواتا ہے۔ انفرادی آزادیوں کی کچھ یہی صورتِ حال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت تک قرآنی سورتوں کے متعلق رہی اس انفرادی آزادی میں حکومت نے دخل دینا مناسب خیال نہ کیا۔

عہدِ عثمانی میں قرآنی خدمت کی نوعیت

لیکن مختلف ممالک وامصار کے لوگ جب اسلام میں داخل ہوئے جن میں عرب ہی نہیں بلکہ بیرونِ عرب کی بھی ایسی بڑی آبادیاں شریک تھیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔

عربی لب ولہجہ کا اختلاف قبائل عرب اور عربی وغیر عربی مسلمانوں میں:

الفاظ وحروف کے صحیح تلفظ کی قدرت عموماً ان ہی میں پائی جاتی تھی، نیز خود عرب میں بھی قبائلی اختلاف لب ولہجہ میں بہ کثرت پایا جاتا تھا، اور اختلاف کی یہ نوعیت دنیا کی تمام زبانوں میں عام ہے۔ ابن قتیبہؒ نے لب ولہجہ کے قبائلی اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

''فالهذلي يقرء عتى عين والاسدي يقرء تِعلمون بكسر والتميمي يهمل والقريشي لايهمل.'' (۱)

ترجمہ: ''ہذلی یعنی بنی ہذیل کے قبیلہ والے (حتیٰ حین) کو عتیٰ عین پڑھتے ہیں، اسی طرح تعلمون کی (ت) کو زیر کے ساتھ اسدی یعنی بنی اسد والے تلفظ کرتے ہیں اسی طرح تمیمی اہمال سے کام لیتا ہے قریشی یہ نہیں کرتا۔''

اسی طرح تابوت کا تلفظ خود مدینہ والے ''تابوہ'' کرتے تھے، اور بھی اس کی

(۱) تبیان فی مباحث القرآن، ص:۴۴، صالح الجزائری

بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔قرآن کے پڑھنے میں عربی قبائل اور عجمی نومسلموں کی طرف سے ان اختلاف کا جب ظہور ہوا اور ہر ایک اپنے تلفظ کی صحت پر اصرار بے جا کرنے لگا تو اس وقت حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس نسخہ کی نقل کرانے کے لیے جو عہدِ صدیقی میں تیار ہوا تھا،حکومت کی طرف سے ایک سررشتہ قائم کردیا۔اس سررشتہ کے افسر وہی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہی مقرر کیے گئے جنہوں نے عہدِ صدیقی میں نسخہ تیار کیا تھا۔(۱) اور مزید گیارہ (۱۱) ارکان کا ان کی امداد کے لیے اضافہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ کتابت کی حد تک قرآن کو اسی لہجہ اور تلفظ میں لکھا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلفظ اور لہجہ تھا۔اسی سررشتہ نے صدیقی نسخہ کی چند نقلیں تیار کیں پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ایک نسخہ سررشتہ کا تیار کیا ہوا مختلف صوبوں کے پایہ تخت اور چھاؤنیوں میں بھیج کر فرمان جاری کردیا کہ اپنے اپنے قبائل یا انفرادی لہجوں یا تلفظ کے لحاظ سے لکھے ہوئے قرآنی نسخے لوگوں کے پاس جو موجود ہوں وہ حکومت کے حوالہ کردیئے جائیں تاکہ ان نسخوں کو معدوم کردیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن شریف کی خدمت یہی اور صرف یہی ہوئی ہے جو بجائے خود بہت بڑی اور اہم خدمت ہے ورنہ مختلف عربی قبائل اور عجمیوں کے طریقۂ ادا لب ولہجہ کے اختلاف کی بنیاد پر لکھے ہوئے قرآنی نسخے خدانخواستہ اگر دنیا

(۱) زید بن ثابت نوعمری میں ہی مسلمان ہوئے تھے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت کے ساتھ کتابت کا کام ان سے لیا کرتے تھے حتیٰ کہ اسی سلسلہ میں یہودیوں کے اور زبان کی تعلیم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انہوں نے حاصل کی تھی۔یہ ان صحابیوں میں سے ہیں جنہوں نے تصنیفی یادگار چھوڑی،فرائض ومواریث کے متعلق ان کی ایک کتاب کا ذکر مورخین کرتے ہیں۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

میں پھیل جاتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ دشمنانِ اسلام اس بات کو بتنگڑ بنا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ لکھاوٹ یعنی نوشت وکتابت کی حد تک انہوں نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کردیا،رہا تلفظ تو ظاہر ہے کہ اس میں وحدت اور یکسانی کا مطالبہ ان کے بس کی بات تھی بھی نہیں اسی لیے اس مطالبہ کو نظر انداز کردیا گیا اور آزادی بخشی گئی کہ جس کا جو تلفظ ہے یا تلفظ کی جس نوعیت پر جو قادر ہے اسی تلفظ اور لب ولہجہ میں قرآن شریف کو وہ پڑھ سکتا ہے۔ایک حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجود تھی ، جس میں فیصلہ فرمادیا گیا تھا کہ قرآن مجید ایک ہی "حرف" یعنی تلفظ پر نازل نہیں ہوا ہے بلکہ "سبعة أحرف"(۱) یعنی متعدد تلفظ کی اس میں گنجائش ہے اگرچہ کوشش تو اسی کی کرنی چاہیے کہ اسی لب ولہجہ میں قرآن کی تلاوت ہر مسلمان کو میسر ہو جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لب ولہجہ تھا۔اسی لیے تجوید اور قرأت کا ایک مستقل فن ابتداء ہی سے مسلمانوں میں مروج ہوگیا اور عبرت کے لیے (یعنی یہ بتانے کے لیے کہ کوشش کی جائے تو غیر عربی آدمی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریشی لب ولہجہ میں قرآن پڑھ سکتا ہے) قرأت وتجوید کے لئے اسی قسم کے لوگوں کا عہد صحابہ وتابعین ہی میں عموماً انتخاب کیا گیا جو نسلاً عرب نہ تھے،فن قرأت کے ائمہ بعد کو یہی عجمی نژاد قاریوں

(۱) جس حدیث میں "سبعة أحرف" کا ذکر آیا ہے،جس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ سات حرفوں پر قرآن نازل ہوا ہے۔اس کی شرح میں حدیث کے شرح کرنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اربابِ تحقیق کا فیصلہ یہی ہے کہ "سبعة" یعنی سات کے عدد سے واقعی سات کا عدد مراد نہیں ہے بلکہ اردو میں جیسے بیسیوں کے لفظ سے صرف کثرت مقصود ہوتا ہے یہی حال عربی زبان میں سات کا ہے اور "أحرف" یعنی حرفوں سے وہی تلفظ اور لب ولہجہ کا اختلاف مقصود ہے۔دیکھو طیبی شرح مشکوٰۃ (ج:۴،ص:۲۸۸) وغیرہ۔

کی جماعت ہوئی۔(۱)

بہرحال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا کارنامہ قرآن کے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے کہ کتابت اور لکھاوٹ کی حد تک تلفظ اور لب ولہجہ کے جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا اور یہ کام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً کل چودہ پندرہ سال بعد انجام پایا۔ آج ممکن ہے کہ خلافتِ عثمانی کے عہد کی اس قرآنی خدمت کی قیمت واہمیت کا لوگوں کو صحیح اندازہ نہ ہو سکے، لیکن ذرا سوچیے تو سہی کہ ابتداء ہی میں مسلمانوں کو کتابت کی اسی ایک شکل پر جمع نہیں کر دیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

عجمی مسلمانوں کو تو ابھی جانے دیجئے خود عربی قبائل میں تلفظ اور لہجوں کے اختلافات کیا معمولی تھے؟ قرآنی آیت "قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا" (مریم: ۲۴) کو قبیلہ قیس والے جو "ک" تانیث کا تلفظ "ش" سے کرتے تھے ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر یہی آیت قیس کے قبیلہ والوں کے قرآن میں بایں شکل لکھی ہوئی ملتی یعنی "قَدْ جَعَلَ رَبُّشِ تَحْتَشِ سَرِيًّا" قیس کے اس طرز تلفظ کا اصطلاحی نام کشکشۂ قیس تھا۔ اسی طرح تمیم والے "اَن" کے لفظ کو "عن" کی شکل میں ادا کرتے تھے اس کا نام عنعنۂ تمیم تھا۔ مثلاً "فَعَسَى اللّٰهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ" (مائدہ: ۵۲) کو "عَسَى اللّٰهُ عَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ" کی شکل میں وہ

(۱) اور واقعی اس پر تعجب ہوتا ہے کہ قراء قرآن کے طبقہ اولی ہی میں ہم قالون اور ورش وغیرہ نام رکھنے والے بزرگوں کو پاتے ہیں۔ ورش تو خیر کہتے ہیں کہ ورشان (فاختہ) کے عربی لفظ کا اختصار ہے لیکن قالون کے متعلق تو اس کی تصریح کی گئی ہے کہ یورپین یعنی رومی لفظ ہے، لکھا ہے کہ عربی میں پہنچ کر صرف اتنا تصرف ہوا کہ کالون کو قالون یعنی کاف کو قاف سے بدل دیا گیا کہتے ہیں کہ کالون کے معنی جید کے ہیں باقی یوں بھی آپ کو قراء سبعہ جو اس فن کے ائمہ ہیں ان میں زیادہ تر عجمی النسل اور موالی طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات ملیں گے۔۱۲ (مناظر احسن گیلانی)

ادا کرتے تھے اور سب سے دلچسپ اُس قبیلہ کا تلفظ تھا جو "س" کے حرف کو "ت" کی شکل میں ادا کیا کرتا تھا اسی وجہ سے پوری سورۃ 'والناس' کی ہر آیت کے آخری لفظ میں بجائے "س" کے ان کے قرآن میں ہم گویا "ت" کو پاتے مثلاً "قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاتِ" اس معاملے میں لوگ اس درجہ مجبور تھے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اصلاً ونسلاً ہذلی قبیلہ سے تھے ان تک کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس لیے ٹوکا کہ وہ "حَتّٰى حِيْنٍ" کا تلفظ "عَتّٰى عِيْنٍ" کی شکل میں کر رہے تھے۔(۱)

جب خالص عربی قبائل کا یہ حال تھا تو بے چارے عجمیوں میں پہنچ کر قرآنی نسخوں کی جو حالت ہوتی وہ ظاہر ہے۔ دور کیوں جایئے ہندوستان ہی کا نتیجہ کیا ہوتا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس صورت میں جتنے قرآن پنجاب میں طبع ہوتے ان میں ہر جگہ بجائے "ق" کی جگہ "ک" ہی چھاپا جاتا، اسی طرح دکن میں جو قرآن چھپتے اس میں "ق" کی جگہ "خ" اور "خ" کی جگہ "ق" لوگوں کو ہر جگہ نظر آتا۔ اور اس قسم کے اختلافات کو کون گن سکتا ہے ہر تھوڑے فاصلے سے تلفظ اور لہجے کے یہ اختلافات زبانوں میں پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مدرسہ کے معلمین جو مختلف لہجوں میں قرآن پڑھاتے ہیں انہی میں "کفر بعضهم بعضاً" (۲) کی نوبت تک آ گئی تھی تو سمجھا جا سکتا ہے کہ آگے بڑھ کر یہی اختلافات مسلمانوں کو خطرے کے کس نقطہ تک پہنچا دیتے؟

(۱) قبائل عرب کے لب ولہجہ کے اختلاف کے سلسلے میں جو مثالیں دی گئی ہیں علاوہ دوسری کتابوں کے الجزائری "التبیان" میں بھی اس کا کافی مواد مل سکتا ہے۔ دیکھیے صفحات: ۳۷، ۴۷ وغیرہ۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت کا ذکر بھی اسی کتاب میں کیا ہے۔۱۲

(۲) یعنی بعض کو کافر ٹھہرانے لگے۔ اس کی تفصیل بھی اور کتابوں کے سوا تبیان ہی میں مل سکتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کیا جامع القرآن تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کی اس عظیم و جلیل خدمت کے مسلمان بہت ممنون نظر آتے ہیں اور عموماً اس کا تذکرہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت اچھا کیا اور جو کچھ کیا ہم سب کے مشورے سے کیا، انہوں نے پوچھا کہ مسلمانوں میں یہ جھگڑا جو چھڑ گیا ہے کہ ہر ایک اپنی قرأت کو دوسروں کی قرأت سے بہتر قرار دیتا ہے بلکہ دوسرے کی قرأت کو کفر کی حد تک پہنچا دیا جاتا ہے اس کا علاج کیا کیا جائے؟ ہم لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا علاج سوچا ہے؟ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا:۔

"نری أن نجمع الناس علی مصحف واحد." (۱)

ترجمہ: "ہمارا خیال ہے کہ لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کر دیا جائے۔"

یہی "جمع الناس علی مصحف واحد" عہدِ عثمانی کی قرآنی خدمت کی صحیح تعبیر ہے یعنی مسلمانوں کو ایک ہی مصحف پر آپ نے جمع کر دیا۔ عوام نے ان کے اسی خطاب کو جامع القرآن (۲) کے نام سے مشہور کر دیا جو نہ صرف یہی کہ واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں

(۱) دیکھو مختصر کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد، ج:۲،ص:۵۰۔

(۲) یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں میں یہ غلط فہمی زمانہ سے پھیلی ہوئی ہے۔ تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا یہ قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے "المشهور عند الناس ان جامع القرآن عثمان وليس كذلك ، انما حمل عثمان الناس على القراة بوجه واحد" (لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع القرآن ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے انہوں نے لوگوں کو قرآن کی ایک ہی قرأت پر صرف جمع کیا) (الاتقان، ج:۱،ص:۶۰)۔ اتقان ہی (جاری ہے)

ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ عام طور پر اس تعبیر سے بڑی غلط فہمی پھیل گئی، لوگ سمجھنے لگے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے گویا قرآن جمع کیا ہوا یا لکھا ہوا نہ تھا اور یہ تو ایک تعبیری غلطی ہے، بجائے جامع القرآن کے جامع الناس علی القرآن سے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اس کی اصلاح ہو سکتی ہے مگر یہی قصہ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف قرآن کی اسی خدمت کا انتساب اور اسکی شہرت ایک بڑے فتنہ کا مقدمہ بن گئی۔ اور اب ہم اسی فتنہ کے متعلق جیسا کہ مولانا گیلانی نے لکھا ہے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ایک بڑے فتنہ کا سدِّ باب:

بنی امیہ نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر کے جب خلافت کو سلطنت کی شکل میں بدل دیا اور روم و ایران کے حکمرانوں کو نمونہ بنا کر حکومت کرنے لگے تو مسلمانوں میں قدرتاً جیسا کہ چاہیے تھا بے چینی پیدا ہوئی اور اس نے ایک عام کشمکش کی شکل حکومت اور عوام کے درمیان پیدا کر دی اس کشمکش کے دبانے کے سلسلہ میں جو بے پناہ مظالم بنی امیہ کے حکمرانوں کی طرف سے مسلمانوں پر توڑے گئے ان کے لئے صرف ایک حجاج ہی کا نام کافی ہو سکتا ہے جس نے ایک لاکھ (۱۰۰،۰۰۰) مسلمانوں کو صبراً (سامنے باندھ کر) قتل کروایا۔

= میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے کہ صرف قریش کے لغت اور لب ولہجہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن لکھوایا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ "ان كان قد وسع في قرائته بلغة غيرهم رفعا للحرج والمشقة" (ج:۲،ص:۶۰) یعنی صرف کتابت کی حد تک قریش کے لب ولہجہ کی پابندی کی گئی باقی پڑھنے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ دوسرے لہجہ و تلفظ میں بھی لوگ پڑھ سکتے ہیں اس سے تنگی اور مشقت کا ازالہ مقصود تھا۔

اسی کشمکش کے سلسلہ میں لعنت وملامت کا قصہ جب دراز ہوا تو بنی امیہ سے آگے بڑھ کر بعض خفیف العقل گرم مزاج لوگوں کی زبانیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بھی کھلنے لگیں کیونکہ بنی امیہ والے آپ کے نام اور خاندانی تعلق سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے اور مسلمانوں پر احسان جتاتے تھے کہ ہمارے خاندان ہی نے تمہارے قرآن کو محفوظ کر دیا ورنہ تمہارے مذہب کی بُنیاد ہی ختم ہو جاتی اور اشارہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی اسی قرآنی خدمت کی طرف کیا جاتا۔ عبدالملک بن مروان برسرِ منبر مسلمانوں سے کہتا:۔

" فالزموا مافی مصحفکم الذی جمعکم علیه الامام المظلوم.(رحمه الله)" (۱)

ترجمہ: ''مسلمانو! اپنے مظلوم امام وخلیفہ (یعنی عثمان رضی اللہ عنہ) کے مصحف کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔''

ظاہر ہے کہ قرآن جو نہ بے چارے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نازل ہوا تھا نہ انہوں نے اس کو ابتداء لکھوایا تھا، حتیٰ کہ ایک جلد میں تمام سورتوں کو مجلد کرانے کا کام بھی ان کی حکومت کی طرف سے نہیں انجام پایا تھا۔ البتہ آخر میں بجائے مختلف لہجوں کے کتابت کی حد تک مسلمانوں کو ایک ہی نسخہ پر جمع کرنے کا انتظام اپنی حکومت کی طرف سے کر دیا تھا محض اس لیے اس قرآن کو جس کو اللہ تعالی نے نازل کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، امام مظلوم کا مصحف اور قرآن قرار دینا مسلمانوں کو برہم کر دینے کے لئے کافی تھا، ردِّ عمل آخر اس کا اس شکل میں ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قرآنی خدمت کی اہمیت ہی کو لوگ اٹھانے لگے اور فریق مخالف میں جو زیادہ تند خو، گرم مزاج تھے وہ حضرت عثمان رضی

(۱) طبقات ابن سعد (ج:۵،ص:۲۳۳) ذکر عبدالملک ۔۱۲

اللہ عنہ پر اُلٹ کر طرح طرح کے الزامات بھی تھوپنے لگے اور جو قرآن خالقِ عالم کی طرف سے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سارے جہاں کے انسانوں کے لیے اُترا تھا اُس کا نام ہی ان لوگوں نے ''بیاضِ عثمانی'' العیاذ باللہ رکھ دیا جو ''مصحفِ امام مظلوم'' کے کلوخ کی پاداش بہ شکل ''سنگ'' تھی۔ سچ پوچھیے تو بنی امیہ کے اسی طرزِ عمل کی مخالفت میں بعض ناعاقبت اندیش لوگوں نے مسلمانوں میں جعلی بے سروپا روایتیں خود ہی گھڑ گھڑ کر پھیلا دیں اور ان میں جو زیادہ چالاک تھے، جانتے تھے کہ جعلی روایتوں کا پردہ بآسانی چاک ہو جائے گا۔ انہوں نے بعض صحیح اور ثابت روایتوں کو غلط مقصد کے لئے استعمال کیا ان لوگوں کی یہ دوسری تدبیر زیادہ کارگر ثابت ہوئی اچھے اچھے لوگ ان مغالطوں کا شکار ہوگئے۔ اس سلسلہ میں مولانا گیلانی نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

سہولت کے لیے روایات کے اس ذخیرہ کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ تو ان خود تراشیدہ فرضی روایات کا ہے مولانا نے جن کی تعبیر مضحکات کے لفظ سے کی ہے، کیونکہ ان کو سُن کر کوئی شخص اپنی ہنسی مشکل ہی سے ضبط کر سکتا ہے اور جن صحیح روایات سے ناجائز نفع اٹھاتے ہوئے مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ان کے لئے ''مغالطات'' کا عنوان قائم کیا جائے گا۔

مضحکات:

۱۔ کہا جاتا ہے کہ قرآنی آیت "وَقِفُوْهُمْ إِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ" (الصافات: ۲۴) کے آخر میں "عن ولایة علی" کے الفاظ تھے جنہیں عہدِ عثمانی میں قصداً قرآن

سے خارج کر دیا گیا یعنی قرآن میں یہ لکھا ہوا تھا کہ میدانِ حشر میں لوگوں کو کھڑا کر کے علی کی ولایت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

۲۔ اسی طرح کوئی صاحب ''محمد بن جہم الہلالی'' تھے، امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے انہوں نے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت ''أمة هي أربى من أمة'' (النحل: ۹۲) میں تحریف کی گئی ہے اصلی الفاظ ''أئمتنا هي أربى من أئمتكم'' (۱) تھے۔

۳۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ قرآن میں قبیلہ قریش کے ستر (۷۰) نام بقید نسب موجود تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کو ساقط فرما دیا۔

۴۔ اسی طرح ''كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ'' (الأحزاب: ۲۵) کی آیت میں کہتے ہیں کہ علی بن طالب کے الفاظ بھی تھے۔ (۲) اس قسم کی بیسیوں (۳) خرافات اس طبقہ کی طرف سے پھیلائی گئیں۔ اگر مسلمانوں کے پاس روایتوں کے جانچنے کا خاص طریقہ راویوں کی تحقیق کے متعلق نہ ہوتا تو ان جھوٹی قطعاً جعلی روایتوں کے متعلق بے بنیاد اور محض گپ ہونے کا فیصلہ آسان نہ ہوتا۔ ان لوگوں نے حد کر دی کہ الفاظ ہی نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ سورۂ ولایت کے نام سے ایک مستقل سورۃ ہی قرآن میں تھی جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس پوری سورت ہی کو حذف کر دیا۔ بہرحال اس شیعی عالم نے جس کا پہلے بھی میں نے ذکر کیا ہے یعنی

(۱) ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ وحکمران بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔۱۲۔

(۲) جس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ کے لیے خدا اور علی مسلمانوں کی طرف سے کافی ہو گئے۔۱۲۔

(۳) یہ سارے مضحکات آپ کو تفسیر ''روح المعانی'' کے مقدمہ ص: ۲۳، ۲۴ میں مل سکتے ہیں۔۱۲۔

علامہ طبرسی نے ان ساری گپوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''الزيادة فيه اى القران فمجمع على بطلانها و اما النقصان فقد روى عن قوم من اصحابنا و قوم من حشوية العامة والصحيح خلافه.'' (روح المعانی، ج:، ص:۲۴)

ترجمہ: ''قرآن میں (غیر قرآنی عنصر کا) اضافہ یہ مسئلہ تو اجماعی و اتفاقی ہے (شیعوں اور سنیوں دونوں کا) کہ ایسا نہیں ہوا، باقی کمی (یعنی قرآن کی کچھ آیتیں حذف ہو گئیں) سو ہمارے یہاں کے بعض لوگ (یعنی بعض شیعی مسلک رکھنے والے) اور عامہ یعنی سنیوں کے بعض حشویہ سے اس کا دعویٰ منقول ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔''

میں عرض کر چکا ہوں کہ ''إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ'' (۱) کی ذمہ داری جب خود خدا لے چکا ہے اور بالاتفاق شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک یہ قرآن کی آیت ہے تو قرآن سے کسی چیز کے نکل جانے کے دعوے کے بعد آدمی مسلمان ہی کب باقی رہتا ہے۔ بقول شیعی عالم علامہ طبرسی، تواتر و توارث کی جس راہ سے قرآن مجید منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اس کا مقابلہ بھلا یہ خود تراشیدہ افسانے کہاں تک کر سکتے ہیں۔

مغالطات:

رہا روایتوں کا دوسرا حصہ جنہیں مولانا گیلانی نے مغالطات کا نام دیا ہے۔ دراصل انہی کی طرف طبرسی نے اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ عامہ کے حشویہ یعنی اہلِ

(۱) یعنی ہم ہی پر ہے قرآن کا جمع کرنا۔۱۲۔

سنت کے محدثین میں بھی نقص کی بعض روایتیں پائی جاتی ہیں، یعنی اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں جو پہلے قرآن میں شریک تھیں بعد کو حذف ہوگئیں لیکن ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بجائے خود یہ روایتیں غلط نہیں ہیں بلکہ ان سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا وہ بدنیتی یا کم از کم غلط فہمی پر ضرور مبنی ہے۔ بقدر ضرورت ان میں جو چیزیں قابلِ ذکر ہیں ان کا قصہ بھی سُن لیجئے۔

اس سلسلہ میں مختلف نوعیت کی روایتیں ہیں۔ مثلاً

(۱) بعض روایتوں میں کسی غیر قرآنی حکم کا ذکر کرتے ہوئے اس قسم کے الفاظ یعنی،

"فی ما أنزل من القران."

ترجمہ: ''یہ اسی سلسلہ اور راہ کی چیز ہے جس راہ سے قرآن نازل ہوا۔''

حدیث رضاعت:

جیسے الفاظ راوی نے بڑھا دیئے ہیں اس کی مثال رضاعت والی روایت جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے الفاظ حدیث کے یہ ہیں، یعنی وہ فرماتی تھیں کہ:۔

"فیما أنزل من القران عشر رضاعات معلومات یحرمن ثم نسخن بخمس معلومات فتوفی صلی الله علیه وسلم وهن فیما یقرأ من القران." (۱)

(۱) صحیح مسلم (ج:۱،ص:۱۷۲)، ابوداؤد (ج:۲،ص:۳۸۰)، ترمذی (ج:۲،ص:۴۴۳)، نسائی (ص:۹۳۷ طبع دوم ۲۰۰۱ء)، ابن ماجہ (ج:۳،ص:۲۷۲)

ترجمہ: ''ان ہی باتوں میں جو اسی راہ سے نازل ہوئی ہیں جس راہ سے قرآن نازل ہوا یہ حکم بھی تھا کہ دس گھونٹ یا دس دفعہ پینا حرام کردیا ہے پھر منسوخ ہوگیا یہ حکم ''پانچ مقررہ گھونٹ سے'' اور وفات پاگئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ حکم ان ہی باتوں میں شریک تھا جن میں قرآنی حکم شریک ہیں۔''

واقعہ یہ ہے کہ بجز بخاری کے صحاح ستہ کی عام کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ **"فی ما أنزل من القران"** یا **"فی ما یقرء من القران"** کے الفاظ سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ یہ قرآن کے اجزاء تھے۔ تفصیل کے لیے تو مولانا گیلانی کی اصل کتاب کا مطالعہ مناسب ہوگا، یہاں اسی کتاب سے اخذ کر کے بقدر ضرورت بحث کی جاتی ہے۔

آخر اتنی بات سے تو ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو احکام و قوانین امت کو عطا کیے جاتے تھے اُن میں ایک سلسلہ تو اُن احکام کا تھا جن کی تعلیم حق تعالیٰ کی طرف سے جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے اور دوسرا سلسلہ احکام ہی کا ایسا بھی تھا جن میں پیغمبر خود اپنے اجتہاد سے کام لیتے تھے، اگرچہ "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" (النجم:۴) کے لحاظ سے ہم دونوں کو وحی ہی سمجھتے ہیں۔ بہرحال ظاہر ہے کہ وحی کا وہ سلسلہ جو جبرئیلِ امین کی راہ سے جاری تھا وہ اپنی الگ نوعیت رکھتا تھا۔ پھر جبرئیل امین کی راہ سے جو چیزیں آرہی تھیں ہر ایک جانتا ہے کہ ان کی بھی دو قسمیں تھیں، یعنی ایک قرآن اور قرآنی آیات کا سلسلہ اور دوسرا سلسلہ جبرئیل امین ہی کے ذریعہ سے وہ بھی جاری تھا جو قرآن کا جزء نہیں بنتا تھا گویا منطقی طور پر یوں کہہ لیجئے کہ قرآن تو وہ ہے جبرئیل کے ذریعہ نازل ہوا لیکن ہر وہ چیز جو جبرئیل کے ذریعہ سے نازل

ہوتی تھی اس کا قرآن ہونا ضروری نہ تھا آخر ایمان، اسلام واحسان کے متعلق سوال وجواب کا جو قصہ بخاری (ج:۱،ص:۱۲) میں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کے متعلق فرمایا کہ:۔

"جاء جبرئیل علیه السلام یعلمکم دینکم."

ترجمہ: "تمہارے پاس جبرئیل آئے تھے تم کو تمہارا دین سکھانے کے لیے۔"

ظاہر ہے کہ جبرئیل نے اس وقت دین کے متعلق جو کچھ سکھلایا تھا یقیناً وہ قرآن میں شریک نہیں کیا گیا اور یہی ایک روایت کیا اکثر چیزیں اسی قسم کی بتوسط جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں لیکن وہ قرآن میں شریک ہونے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھیں اسی لیے قرآن میں شریک نہیں کی گئیں۔

اسی بنیاد پر "فی ما أنزل من القرآن" سے راوی کا مقصد یہ ہے کہ یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادی مسائل میں سے نہ تھا بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس راہ سے قرآن نازل ہوا ہے اسی راستہ سے یہ حکم بھی اللہ تعالیٰ کے رسول تک پہنچا تھا۔ اور یہ کہ قرآن کو جس راہ کی چیز سمجھ کر پڑھا جاتا ہے اسی راہ کی چیز یہ بھی ہے اور یہی معنی ہیں "فیما یقرء من القرآن" کے یعنی جو کچھ قرآن میں پڑھا جاتا ہے جس راہ سے وہ آیا اُسی راہ کی چیز یہ بھی ہے۔

رجم کی روایت:

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ روایت ہے جس میں رجم کا ذکر ہے یعنی شادی شدہ آدمی سے زنا کا صدور جب ہو تو سنگساری کا حکم اسلام میں جو دیا گیا ہے اس

کے متعلق بخاری شریف (ج:۲،ص:۱۰۰۹) میں ایک طویل حدیث اس سلسلہ میں پائی جاتی ہے، حاصل جس کا یہ ہے کہ حج کے موسم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر ملی کہ بعض لوگ ان کی وفات کے بعد خلافت کے متعلق کچھ منصوبے پہلے سے پکا رہے ہیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انتخاب پر کچھ اعتراض بھی کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو چاہا کہ حج ہی کے موقع پر ایک تقریر کریں، لیکن بعد کو رائے بدل گئی اور مدینے پہنچ کر آپ نے جمعہ کے خطبہ میں ان ہی باتوں کا ذکر فرمایا جن کا تذکرہ حج کے موقع پر کرنا چاہتے تھے، یہ بڑی طویل تقریر ہے جس میں بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں اسی میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ذکر آپ نے فرمایا اور مسلمانوں کو اس کی وصیت کرتے ہوئے کہ میرا کیا ٹھکانہ ہے آج ہوں کل نہ ہوں اس لیے چند ضروری باتوں کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رجم کا قانون اگرچہ قرآن میں نہیں پایا جاتا مگر میں گواہی دیتا ہوں کہ:۔

"کان مما أنزل الله."

ترجمہ: "یہ قانون بھی ان ہی باتوں میں سے ہے جنہیں اللہ نے نازل فرمایا۔"

پھر یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قانون کو ہم نے سیکھا پڑھا اور یاد کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل بھی کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ اسی کے بعد آپ نے زور دے کر کہا کہ قرآن میں نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ یہ خدا کے نازل فرمودہ قوانین میں نہیں ہے بلکہ یہ خدا ہی کا برحق اور اسی کا واجب کیا ہوا قانون ہے۔ آخر میں فرمایا کہ پس چاہیے کہ مرد ہوں یا عورت شادی شدہ ہونے کے بعد جو بھی زنا کا ارتکاب کرے اور ثابت ہو جائے تو اس کو رجم (سنگسار) کیا

جائے، یہ عجیب بات ہے کہ اسی کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا:۔

"انا کنا نقرأ فیما نقرأ من کتاب الله ان لا ترغبوا عن اٰبائکم فانه کفر بکم ان ترغبوا عن اٰبائکم."

ترجمہ: ''جس راہ کی چیز سمجھ کر کتاب اللہ (قرآن) کو ہم پڑھتے تھے کہ اپنے باپوں سے اعراض نہ کرو، کیونکہ اپنے باپوں سے اعراض تمہارے لیے کفر ہے۔''

پھر آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور حد سے تجاوز کرجاتے ہیں تم بھی میری تعریف میں اس قسم کے اطراء وغلو سے کام نہ لینا۔

میں نے اس دوسری بات کو عجیب بات اس لیے کہا کہ رجم کے متعلق تو صرف "مما أنزل الله" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا مگر یہ کہ باپوں سے اعراض کرنے کے متعلق جو الفاظ آپ نے فرمائے اس میں تو "کنا نقرأ فیما نقرأ من کتاب الله" (۱) کے الفاظ ہیں لیکن ان الفاظ کے متعلق مسلمانوں میں اس کا کسی زمانہ میں کسی نے بھی چرچا نہ کیا جیسا کہ رجم والے الفاظ کے متعلق پھیلا دیا گیا کہ پہلے وہ قرآن میں موجود تھے اور طرفہ تماشا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن سے الفاظ تو خارج کردیئے گئے لیکن قانون کو جیسا کہ سب جانتے ہیں قیامت تک کے لیے باقی رکھا گیا اور بس کرنے والوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ الفاظ کا ایک مجموعہ بھی بنالیا گیا جو مدرسوں میں آج تک مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں قانون رجم کے متعلق یہی الفاظ تھے، الفاظ کا وہ مجموعہ یہ ہے:۔

(۱) یعنی ہم پڑھتے تھے اس کو اسی سلسلہ میں جس سلسلہ میں قرآن پڑھتے ہیں۔۱۲

"الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموها." (۱)

ترجمہ: ''کوئی بڈھا اور بڈھی جب زنا کریں تو دونوں کو سنگسار کردو۔''

بعضوں میں ''البتۃ'' کے لفظ کا اضافہ بھی پایا جاتا ہے۔ بہرحال صحیحین (بخاری ومسلم) میں یہ "الشیخ والشیخة" والی روایت نہیں پائی جاتی بلکہ ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں بھی نہیں ہے ماسوا اس کے اس روایت کے راویوں کی حالت کیا ہے اس سے اگر قطع نظر بھی کرلیا جائے پھر بھی بقول مولانا گیلانی اس کو قرآن مجید کا گویا معجزہ ہی خیال کرنا چاہیے کہ روایت کے الفاظ ہی سے اس قانون کی تردید ہوجاتی ہے جس کے لیے بنانے والوں نے ان عجیب وغریب الفاظ کے مجموعہ کو بنایا ہے، آپ سُن چکے ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ابھی گذرے ہیں کہ رجم کا قانون شادی شدہ مرد اور عورتوں کے لیے ہی ہے مگر اب ذرا روایت کے ان الفاظ پر غور کیجئے 'الشیخ' (بڈھا) 'والشیخة' (بڈھی) ایسے الفاظ ہیں جن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ شادی شدہ ہوں، پھر نتیجہ کیا ہوا ایسے بڈھے اور بڈھی عورت جن کی شادی نہیں ہوئی ہو ان الفاظ کی بنیاد پر چاہیے کہ ارتکابِ گناہ کے جرم میں سنگسار کردیئے جائیں اور جوان مرد اور جوان عورت شادی شدہ ہی کیوں نہ ہوں چونکہ الشیخ اور الشیخة کے الفاظ ان پر صادق نہیں آتے اس لیے رجم کا قانون ان کے لیے باقی نہ رہا اور یہی کیا رجم کا قانون اس روایت کی بناء پر صرف اسی زنا سے متعلق ہوگا جب بڈھے اور بڈھی ہوں لیکن ایک طرف بڈھا اور دوسری طرف جوان یا

(۱) مستدرک حاکم، ج:۵، ص:۵۴ میں یہ روایت متعدد طرق سے نقل کی گئی ہے جو صحیح اور حسن کے درجے کی ہیں۔ امام حاکم اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "**هذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاه**" اس حدیث کی سند صحیح درجہ کی ہے اور امام بخاریؒ ومسلمؒ نے اپنی صحیح میں ذکر نہیں کی ہے۔ اسکے علاوہ بھی متعدد کتب حدیث میں ہے۔

بالعکس ہوتو اس پر بھی یہ قانون عائد نہ ہوگا اور سچی بات تو یہ ہے کہ شیخوخت عربی زبان میں عمر کے جس حصہ کی تعبیر ہے یہ عمر کا وہ زمانہ ہے جس میں عموماً جنسی خواہش کا زور کم کیا بلکہ بسا اوقات مفقود بلکہ حد نفرت کو بھی پہنچ جاتا ہے۔ جوان عورت کے ساتھ تو ممکن ہے کوئی بڈھا مشغول ہو جائے یا بالعکس میں بھی امکان ہے مگر جب دونوں پھوس بوڑھے ہوں یعنی الشیخ والشیخۃ بن چکے ہوں تو زنا کے صدور کا امکان ہی کیا باقی رہتا ہے۔ پس مطلب یہ ہوا کہ سرے سے رجم کا قانون ہی غیر عمل بن کر ان الفاظ کی بنیاد پر رہ جاتا ہے۔ کیا تماشا ہے کہ رجم کے قانون کو ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا جس سے اس قانون کی بنیاد ہی منہدم ہو کر رہ گئی۔ کیسی عجیب بات ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی قانون رجم کا ذکر فرماتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں فرماتے تھے کہ قرآن میں اس کو داخل کر کے،

"ان ازید فی کتاب اللہ."

ترجمہ: "میں اللہ کی کتاب میں اضافہ کرنے کا فعل کروں گا۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ اس کا خطرہ اگر نہ ہوتا تو قانون کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ قرآن کے کم از کم حاشیہ پر اس کو لکھ دیا جاتا۔ عمر رضی اللہ عنہ جس کے متعلق کہہ رہے ہوں کہ قرآن میں اس کے داخل کرنے سے اضافہ ہوگا، یعنی جو چیز قرآن کا جزو نہیں ہے وہ قرآن کا جزو بن جائے گی مگر لوگ ہیں کہ یہی کہتے جارہے ہیں کہ قرآن ہی کا جزو رجم کا قانون تھا، (۱) اور مغالطہ کس سے ہوا؟ صرف "کان مما انزل" کے الفاظ سے ہوا۔ مگر

(۱) حقیقت یہ ہے کہ جلد (تازیانہ) کی قرآنی سزا جرم زنا کے متعلق قرآن میں نازل ہو چکی تھی اور اسی بنا پر آدمی کنوار (غیر محصن) ہی کیوں نہ ہو اگر زنا کا مجرم ہوگا تو جلد (تازیانے) کی سزا کا مستحق وہ ہو جاتا ہے مگر قدرتاً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شادی شدہ یعنی محصن زنا سے بچانے والی چیز یعنی (جاری ہے)

آپ دیکھ چکے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے۔ آخر اسی روایت میں تو "رغبة عن الأباء" والے حکم کو بھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی نے اس سے بھی زیادہ تیز تر الفاظ یعنی "کنا نقرأ فیما نقرأ من کتاب اللہ" کے ذریعہ اپنے مطلب کو ادا کیا ہے لیکن اس کا چرچا لوگوں میں کیوں نہیں پھیلا، بڑے بڑے مولوی بھی شاید اس کا استحضار نہ رکھتے ہوں حالانکہ اس قسم کے الفاظ کا مطلب جو کچھ ہوتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان کے اسی حصہ سے چاہیے تھا کہ لوگ سمجھ لیتے، مگر سمجھنے کا جب ارادہ ہی نہ کیا جائے تو اس کا کیا علاج ہے، یہی روایت کیا بلکہ بیر معونہ میں حفاظ قرآن کی کافی تعداد دھوکہ سے جو شہید ہوئی تھی، حدیثوں میں اس قصہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بیچارے بحالت غربت شہید ہوئے تو:

"فأخبر جبرئیل علیه السلام النبی صلی اللہ علیه وسلم انهم

= بیوی رکھتے ہوئے بھی اس جرم کا اگر مجرم ہو تو اس کا جرم اس کنوارے سے یقیناً زیادہ سخت ہے جو اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے ذریعہ (بیوی) سے محروم ہے گویا شادی شدہ (محصن) صرف زنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ شرارت کا مرتکب ہے، اسی لیے صرف زنا کی جو سزا ہے یعنی تازیانے کی سزا سے زیادہ سخت سزا کا طالب خود اس کا جرم ہے زنا کے جرم سے زیادہ شادی شدہ آدمی کے اندر جو شرارت اور بیباکی کی کیفیت پائی جاتی ہے اسی کا اقتضاء یہ ہوا کہ اس کی سزا میں بھی سختی کا اضافہ کر دیا جائے۔ رجم اس قدرتی اقتضاء کی تکمیل ہے۔ اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی جیسا کہ بخاری (ج:۲،ص:۱۰۰۶) میں ہے فرمایا کرتے تھے کہ: "رجمتها بسنة رسول الله" (یعنی محصن کی سزا رجم جو میں نے دی ہی تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی بنیاد پر دی) جس کا مطلب یہی ہوا کہ کسی قرآنی قانون پر اس سزا کی بنیاد قائم نہیں ہے، رہا یہ کہ قرآن میں خالص زنا ہی کا حکم کیوں نہیں اور زنا کے جرم میں احصان کی وجہ سے جو سختی بڑھ جاتی ہے اس حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے سپرد کیوں کر دیا گیا قانونی نزاکتوں سے جو واقف ہیں اس کی مصلحت کو سمجھ سکتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ۱۲۔

لقوا ربهم فرضی عنهم و أرضاهم." (بخاری، ج:۱،ص:۳۹۳)

ترجمہ: "جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ حفاظ قرآن کی یہ جماعت اپنے پروردگار سے جا کر مل گئی پس اللہ ان سے راضی ہوا اور ان لوگوں کو خدا نے خوش کر دیا۔"

روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ خود ان شہید ہونے والے حفاظ نے اللہ تعالی سے یہ دعا قتل ہونے سے پہلے کی تھی کہ:۔

"اللھم أبلغ عنا نبینا انا قد لقیناک فرضینا عنک ورضیت عنا." (۱)

ترجمہ: "اے اللہ ہمارے نبی کو مطلع کر دیجئے کہ آپ سے ہم مل گئے بس ہم آپ سے راضی اور خوش ہوئے اور آپ ہم سے راضی اور خوش ہوئے۔"

اس روایت کا ذکر کر کے حضرت انس رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہم الفاظ کو یعنی ان شہداء کی دعاء کے ان الفاظ کو جن کی خبر جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تھی "فکنا نقرأ" (بخاری، ج:۱،ص:۳۹۳) یعنی پڑھا کرتے تھے پس نقرء کے لفظ سے بعضوں کو مغالطہ ہوا کہ شاید یہ بھی قرآن کا جزء تھا، حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کو نوعیت بھی وہی "فیما أنزل من القرآن" یا "کنا نقرء فیما نقرء من کتاب اللہ" کی ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ پہنچا تھا۔ اور معلوم ہو چکا کہ قرآن کی وحی میں تو جبرئیل علیہ السلام ضرور واسطہ کا کام کرتے تھے لیکن ہر وہ چیز جو جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تھی اس کا

(۱) صحیح مسلم (ج:۱۳،ص:۴۹)

قرآن ہونا ضروری نہ تھا اور یہی صورت حال ان الفاظ کی ہے۔

(۲) مغالطات کے سلسلے میں میرے نزدیک ایسی روایتیں بھی شامل ہیں جن میں صحابی نے کسی قرآنی آیت کا مضمون اور مطلب اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے قرآن کی طرف اس مطلب کو منسوب کر دیا ہے، ہم لوگ یعنی جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے اُردو میں قرآنی آیتوں کا مطلب بیان کرتے ہیں، لیکن صحابہ ظاہر ہے کہ مطلب و معانی کو بھی عربی زبان ہی میں ادا کرتے تھے، بعضوں کو اسی سے مغالطہ ہو گیا کہ صحابہ کے بیان کردہ یہ تفسیری و تشریحی الفاظ بھی قرآن کے اجزاء تھے اس کی ایک اچھی مثال یہ روایت ہے یعنی ایک صحابی نے بیان کیا کہ قرآن میں مَیں نے پڑھا ہے کہ:۔

"لو کان لابن ادم وادیا من مال لابتغی الیه ثانیا ،الحدیث."

ترجمہ: "یعنی آدم کے بچے کے پاس ایک وادی برابر مال ہو تو چاہے گا کہ دوسری وادی بھر بھی مال اس کو مل جائے، آخر حدیث تک۔"

اس میں شک نہیں کہ بجنسہ یہ الفاظ قرآن میں نہیں ہیں لیکن،

"إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً."

ترجمہ: "قطعاً انسان بڑا بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔"(۱)

(۱) حقیقت یہ ہے کہ "ھلوع" کا عربی لفظ جن مطالب پر مشتمل ہے "بے صبرا" کے لفظ سے وہ صحیح طور پر ادا نہیں ہوتا جب تک سطر دو سطر میں اس کی تشریح نہ کی جائے۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ کا خیال آیا کہ مولوی حرم علی ظہوری مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے:۔

خدا فرما چکا قرآں کے اندر — مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

ایک فقیر اسی شعر کو گا گا کر بھیک مانگ رہا تھا جو وہابیوں سے بہت برہم رہتے تھے بولے کہ (جاری ہے)

قرآن کی مشہور آیت ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ "ھلوع" کا مطلب وہی ہے جسے صحابی نے مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کیا پھر اسی مضمون کو انہوں نے قرآن کی طرف منسوب کر کے اگر بیان کیا تو اس سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ بجنسہٖ یہی الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں، آخر روزمرہ کی یہ بات ہے کہ عام گفتگو میں، وعظوں میں، تقریروں میں لوگ مضمون بیان کر کے کہتے ہیں کہ ایسا قرآن میں آیا ہے۔ لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہوگی اگر سننے والا قرآنی آیت کے حاصل مطلب کے بجنسہٖ ان ہی الفاظ کو قرآن میں تلاش کرنے لگے۔

(۲) مغالطہ کی اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ قرآن سناتے ہوئے بعض دفعہ صحابی بیچ میں تفسیر طلب الفاظ کی تفسیر بھی کرتے چلے جاتے تھے، ہندوستانی علماء بھی بکثرت اس کام کو کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے تفسیری الفاظ اُردو میں ہوتے ہی اس لیے سب جانتے ہیں کہ درمیان کے الفاظ قرآنی الفاظ کی تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ صحابہ کی مادری زبان بھی چونکہ وہی تھی جو قرآن کی زبان ہے اسی سے بعضوں نے تفسیر کے ان عربی الفاظ سے یہ غلط نفع اٹھانا چاہا اور مشہور کردیا کہ فلاں سورۃ میں موجودہ الفاظ کے ساتھ فلاں فلاں الفاظ پائے جاتے تھے جو اب قرآن سے خارج ہوگئے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب صحابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہی صورت پیش آئی یعنی وہ سورۃ "البینۃ" سُنا رہے تھے، جب قرآن کے الفاظ:

= قرآن میں یہ کہاں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بھائی "یَآاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ" (الفاطر: ۱۵) (اے انسانو! تم سب اللہ کے محتاج ہو) اس کا مطلب یہی تو ہے کہ مگر وہ یہی کہتے رہے کہ "مرے محتاج ہیں پیرو پیمبر" ان الفاظ کو قرآن میں بتاؤ۔۱۲۔ (مناظر اَحسن گیلانی)

"وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ." (البینۃ: ۵)

ترجمہ: "اور نہیں حکم دیا (ان کو) لیکن صرف اس کا کہ پوجے چلے جائیں اللہ کے دین کو اسی کے لیے خالص بنا کر بالکلیہ اسی کی طرف جھکتے ہوئے۔"

پر پہنچے تو "مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" یعنی دین کو اللہ کے لئے خالص بنانے کا مطلب کیا ہے اسی کو سمجھانے لگے جس کا حاصل یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی مبارک اور اس کی خوشنودی کا حاصل کرنا بھی "الدین" اور مذہب کی خالص روح اور خالص منشاء ہے۔ باقی بعض لوگ جیسے رنگ، نسل، وطن، زبان وغیرہ کو فرقہ واری دھڑابندیوں کا آلہ بنالیتے ہیں اسی طرح ایک طریقہ تقسیم کبھی دین اور مذہب کو بھی بنالیا جاتا ہے اس وقت بجائے رضاءِ حق کے جتھابندی کا محض ایک ذریعہ بن کر مذہب رہ جاتا ہے۔ اس زمانہ میں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت وغیرہ مذاہب مرضی حق تک پہنچنے کے نہیں بلکہ بچی عصبیت کے اُبھارنے کے ذرائع بنے ہوئے تھے۔ اسی توضیحی وتفسیری مطلب کو عربی زبان میں حضرت ابی بن کعب نے ان الفاظ میں ادا کیا:-

"انہ الحنیفۃ المسلمۃ لا الیھودیۃ ولا النصرانیۃ ولا المجوسیۃ."

ترجمہ: "دین خدا کے نزدیک وہی معتبر ہے جس میں حنیفیت (یعنی خدا کی طرف یکسوئی کی گئی ہو جو حنفاء کا مطلب ہے) اور مسلمہ ہو (یعنی اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کردیا جائے) نہ یہودیت نہ نصرانیت نہ مجوسیت (یعنی ان دینی ناموں کو انسانیت کی تقسیم کا ذریعہ بنانا) یہ ان لوگوں کا کام نہیں ہوسکتا جو اپنے دین کو واقعی صرف خدا کے لیے خالص بنانا چاہتے ہیں یا مخلص ہوکر دینی زندگی گزارنا چاہتے

ہیں۔''

مُسند احمد (ج:۵،ص:۱۳۲) کے حوالہ سے "جمع الفوائد" (ج:۳،ص:۲۴۲) میں نقل کیا ہے کہ ان الفاظ کے بعد:

"ثم ختمها بمابقي من السورة."

ترجمہ: ''پھر اُبی رضی اللہ عنہ نے (ان الفاظ کے) بعد سورۃ البینۃ کو ختم کیا۔''

بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ درمیان کے تفسیری الفاظ کو فرمانے کے بعد حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے سورۃ کو ختم کیا۔ واقعہ کی صورت کل یہی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ مغالطے کے سوا اس کو اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر حضرت اُبی کے ان تفسیری الفاظ کے متعلق محض اس لیے کہ وہ عربی زبان کے الفاظ ہیں یہ وسوسہ دلوں میں کوئی ڈالے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک قرآن ہی کے اجزاء (العیاذ باللہ) یہ الفاظ تھے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان سے تھوڑا بہت بھی لگاؤ جو رکھتا ہے سننے کے ساتھ ہی سمجھ سکتا ہے کہ زربفت میں یہ ٹاٹ کا پیوند بن جائے گا اور کچھ ان الفاظ کا نہیں بلکہ اور بھی جن جن روایتوں میں ان تفسیری وتشریحی الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے بذاتِ خود بتا رہے ہیں کہ قرآنی عبارت کے الفاظ اور ان میں کھلا ہوا فرق ہے مگر اس کے لئے عربی ادب کے ذوقِ صحیح کی ضرورت ہے۔

۳۔ اسی سلسلہ کی بعض غیر مستند تاریخی روایتوں میں تذکرہ کیا گیا ہے کہ:۔

"ان ابن مسعود كان ينكر كون سورة الفاتحة والمعوذتين من القرآن." (تبیان الجزائری، ص:۹۶)

ترجمہ: ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی سورۂ فاتحہ یعنی الحمد اور معوذتین یعنی "قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اور "قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ" والی سورتوں کے

متعلق کہتے تھے کہ یہ قرآن کے اجزاء نہیں ہیں۔''

بالفرض ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف مان لیا جائے کہ یہ انتساب صحیح بھی ہو اور قرآن میں جو تواتر کی قوت پائی جاتی ہے اس کا مقابلہ یہ تاریخی روایت فرض کر لیجئے کہ کر بھی سکتی ہو جب بھی کیا اس کا وہی مطلب ہے جو ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ جس کا قرآنی نام "السبع المثانی" (۱) ہے قرآن میں، اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

"وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ." (الحجر:۸۷)

ترجمہ: ''ہم نے تم کو (اے پیغمبر) سبع مثانی (یعنی سورۂ فاتحہ دی) اور قرآن عظیم دیا۔''

جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حقیقت "القرآن العظیم" کے مقابلہ میں جدا رنگ رکھتی ہے۔ جس کی وجہ ظاہر بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی حیثیت درخواست کی ہے جو خدا کے دربار کی حاضری کے وقت یعنی نماز میں بندے کی طرف سے خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتی ہے اور "الٓمّٓ" سے "والناس" تک اسی کا جواب دیا گیا ہے۔ (۲) ابن

(۱) سبع کے معنی سات (۷) کے ہیں اور مثانی ایسی چیز کی تعبیر ہے جو دو دو دفعہ دہرائی جائے چونکہ سورۂ فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اور اس کی خواندگی کا قانونی دستور یعنی نماز میں پڑھنے کا قاعدہ یہی ہے کہ کم از کم دو دفعہ دربارِ الٰہی میں دہرائی جائے اسی لیے بتیراء یعنی ایک رکعت کی نماز ممنوع ہے مثانی کہنے کی وجہ یہی ہے۔

(۲) سندی حالت اس روایت کی جو کچھ ہے یہ مسئلہ اور سورۂ فاتحہ ومعوذتین جن خصوصی حقائق ومعارف پر مشتمل ہیں حضرت الاستاذ گیلانی کی کتاب اور ان کے تفسیری محاضرات میں آپ کو جس کی پوری تفصیل مل سکتی ہے۔

مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اگر اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرما دیا ہو کہ سورۃ فاتحہ "والقرآن العظیم" سے الگ حیثیت رکھتی ہے تو اس کا یہ مطلب سمجھ لینا کیسے صحیح ہوگا کہ سورۃ فاتحہ کے الفاظ کی وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح نہیں ہوئی تھی جیسے باقی قرآن کی وحی ہوئی ہے کہ وحی ہونے میں تو دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ سورۃ فاتحہ اپنی جداگانہ حیثیت جو رکھتی ہے یعنی بندے حق تعالیٰ کے دربار میں جو معروضہ پیش کریں، حق تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے اس معروضہ یا درخواست کی عبارت بھی مرتب کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی فرما دی۔(۱)

انہی روایتوں میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ معوذتین کے متعلق کہا کرتے تھے:۔

"انما امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یتعوذ بھما."

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے کہ ان دونوں سے تعوذ (پناہ گیری) کا کام لیا جائے۔"

مطلب یہ تھا کہ معوذتین (یعنی "قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" اور "قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ") ان دونوں سورتوں کا نزول تعوذ (پناہ گیری) کے لئے ہوا ہے اس لیے قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ان کی جداگانہ حیثیت ہے، میرے نزدیک تو ان الفاظ سے معوذتین کی اہمیت کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ واضح کرنا چاہتے تھے اور واقعہ بھی یہی

(۱) دنیا کی دفتری حکومتوں میں بھی بسا اوقات یہی کیا جاتا ہے کہ درخواست کی عبارت حکومت خود بنا دیتی ہے اس کو چھاپ کر دفتر میں رکھ دیا جاتا ہے، درخواست گزاران مطبوعہ فارم یا تختہ پر دستخط کر کے داخل کر دیا کرتے ہیں۔۱۲۔

ہے کہ کسی قسم کی مصیبت دنیا میں پیش ہو، ان دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے سے تسلی مل جاتی ہے، بہرحال اگر ان روایتوں کے تاریخی ضعف اور اسنادی کمزوریوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے جب بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس بیان کا یہ مطلب لینا کہ وہ ان سورتوں کو حق تعالیٰ کے فرمودہ اور نازل کردہ الفاظ نہیں سمجھتے تھے، قطعاً ان پر بہتان ہے اور بدترین قسم کی مغالطہ بازی ہے کیا کسی حیثیت سے بھی کسی کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی اور سورۃ نہیں بلکہ سورۃ فاتحہ جیسی سورۃ جو نماز کی ہر رکعت میں دن کے پانچ (۵) وقتوں میں دہرائی جاتی ہے اسی کو سمجھتے تھے کہ قرآن کا جز نہیں ہے کچھ اسی قسم کا مغالطہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ صحابی کی طرف اسی روایت کے متعلق ہوا جس میں یہ ہے کہ ان کے قرآنی نسخہ میں وہ دونوں دعائیں جو قنوت میں عموماً پڑھی جاتی ہیں لکھی ہوئی تھیں اسی بناء پر یہ غلط فہمی پھیلانے کی بھی بعضوں نے کوشش کی کہ ان دعاؤں کو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قرآن کے اندر داخل سمجھتے تھے یعنی جیسے دوسری قرآنی سورتیں ہیں اسی طرح دو سورتیں قرآن کی یہ دونوں دعائیں بھی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں، آج بھی تو قرآن کے آخر میں مختلف قسم کی دعائیں خصوصاً ختم قرآن کی دعاء، عموماً لکھی ہوئی رہتی ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ دعائیں قرآن میں شریک ہیں۔ اگر روایت صحیح بھی ہو تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اہمیت کی وجہ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے قرآن کے آخر میں ان دونوں مسنونہ دعاؤں کو لکھ لیا ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ روایت ہی بے سروپا ہے میں نے بھی اس کا ذکر صرف تکمیل مضمون کے لئے کر دیا ورنہ یہ روایت تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ کسی سنجیدہ علمی مقالہ میں جگہ دی جائے۔

ایک ذیلی بحث اور خاتمہ:

مولانا گیلانی نے اپنی کتاب کو جن مباحث پر ختم کیا ہے اسی کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن تو خیر خدا کی کتاب ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی تصنیف کردہ کتابوں مثلاً سعدی کی گلستاں ہی کو لیجئے یا اسی جیسی کوئی دوسری کتاب ان کے پڑھنے والوں کو کبھی نہیں دیکھا کہ پڑھنے سے پہلے وہ اس کی ٹوہ میں لگے ہوں کہ مصنف نے کتاب کے کس باب کو پہلے لکھا اور کس کو بعد میں یا ہر باب کی فصلوں کی عبارتوں میں کس عبارت کی یادداشت پہلے جمع ہوئی اور کونسی بعد میں بلکہ عام قاعدہ یہی ہے کہ مصنف کی طرف سے کتاب پڑھنے والوں کے سامنے جس شکل میں پیش ہوتی ہے اسی آخری شکل کو کتاب کی واقعی شکل قرار دے کر لوگ پڑھنا پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔

اسی عام دستور کے مطابق ظاہر ہے کہ قرآن کی بھی واقعی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جس حال میں پیش کرنے والے نے دنیا کے حوالے قرآن کو کیا بس یہی قرآن کی اصلی شکل ہے، یہی سمجھا بھی گیا، ابتداء سے اس وقت تک اسی شکل میں قرآن نسلہا نسل سے منتقل ہوتا ہوا چلا آرہا ہے لیکن یہ ایک واضح کھلی ہوئی بات ہے، لیکن کچھ دن سے یورپ کے مستشرقین نے دنیا کو قرآن کے متعلق ایک خاص مسئلہ کی طرف متوجہ کیا یعنی اس کتاب کی ہر سورۃ کی ہر ہر عبارت کا ہر فقرہ کب نازل ہوا، اس کا پتہ چلانا چاہیے، باور کرایا جاتا ہے کہ قرآن کی صحیح مرتب شکل وہی ہو سکتی ہے جو نزولی ترتیب کی روشنی میں قائم کی جائے۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا تصنیفی کاروبار کرنے والوں کا عام قاعدہ ہے کہ اپنی تصنیف کو آخری

شکل میں مرتب کرنے سے پہلے متفرق قسم کی یادداشتوں میں مواد کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور بعد کو ان ہی یادداشتوں کی مدد سے آہستہ آہستہ اپنی کتاب کو مکمل کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات یہ بھی کیا جاتا ہے کہ کتاب کے جس حصہ کے متعلقہ مواد کو دیکھتے ہیں کہ فراہم ہو چکا ہے تو پہلے اسی حصہ کو لکھ لیتے ہیں یوں ہی سہولتوں کے لحاظ سے بتدریج یہ کام جب پورا ہو جاتا ہے، تب آخری شکل میں کتاب کو مرتب کر کے دنیا کے سامنے دستور ہے کہ مصنفین اپنی کتاب پیش کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہی آخری شکل اس کتاب کی اصلی اور واقعی شکل قرار پاتی ہے اور کسی کے دل میں اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ مصنف کو کن کن مراحل سے اپنی تصنیف کے اس جدوجہد میں گزرنا پڑا، اس کا پتہ چلایئے اور اس سلسلہ میں مصنف کی پرانی فائلوں اور ان بستوں کو ٹٹولیے جن میں اس کی یادداشتیں رکھی جاتی تھیں اور کاغذ سیاہی وغیرہ کی کہنگی اور تازگی کو دیکھ دیکھ کر فیصلہ کریئے کہ ان یادداشتوں میں تاریخی طور پر کن کو مقدم اور کن کو موخر قرار دیا جائے یا یہ کہ مصنف نے اپنی کتاب کے کس حصے کو پہلے مکمل کیا اور کس حصہ کی تکمیل بعد کو کی۔ بالفرض "غم نداری بز بخر" کی ان غیر ضروری جھنجٹوں میں کوئی خواہ مخواہ مبتلا بھی ہو تو ایک قسم کے غیر ضروری خبط کے سوا اور اسے کیا سمجھا جا سکتا ہے تاہم انسانی تصنیفات کے متعلق سراغرسانی کی اس غیر ضروری مہم کا ممکن ہے کچھ فائدہ بھی ہو۔ غریب آدمی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف حالات سے گزرتا رہتا ہے۔ کبھی انشراح قلب انبساط ونشاط کی حالت میں رہتا ہے کبھی انقباض وکوفت دماغی میں مبتلا ہو جاتا ہے یہ اور اسی قسم کے دوسرے نفسیاتی کیفیات کا اثر جیسے زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے۔ انسان کے تصنیفی کاروبار بھی اس سے متاثر ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، اور کچھ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ کتاب کے کس حصہ کو نشاط وانبساط کی حالت میں مصنف نے لکھا

ہے اور کن حصوں کی تکمیل انقباض وکوفتِ دماغی کے زمانے میں ہوئی، اس ٹٹول سے اسی کا پتہ چل جائے۔ مگر اللہ میاں کے متعلق تو مزاجی اور دماغی اتار چڑھاؤ کی اس کیفیت کی گنجائش نہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمانوں کا ایک طبقہ جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے ادھر کچھ دنوں سے اس لایعنی، غیر ضروری مشغلے میں یورپ کے مستشرق نما پادریوں کے اغوائی اشاروں سے اُلجھ گیا ہے خود بھی اسی میں الجھا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ جس مسئلہ کا مسلمانوں کے دل پر کسی زمانہ میں کبھی کسی قسم کا کوئی خطرہ بھی نہیں گزرا تھا اسی مسئلہ میں الجھا دے۔ بڑھتے ہوئے بعض تو یہاں تک پہنچ کر کہنے لگے کہ قرآن کا مطلب ہی مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ موجودہ ترتیب کو اُلٹ پلٹ کر نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کر کے نہ پڑھا جائے۔ بقول مولانا گیلانی پادریوں کی بات تو کچھ سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ وہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی افکار وخیالات کا العیاذ باللہ مجموعہ سمجھتے ہیں اس لیے نزولی ترتیب کے پتہ چلانے کا فائدہ یہ بتاتے ہیں کہ اس ذریعہ سے ہم ایک زبردست دماغ کی ترقی، ایک پاکیزہ روح کی کمزوری وتوانائی اور ایک بڑے انسان کی ناگزیر نیرنگیوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔(۱) لیکن خیال تو کیجیے کہ ایک مسلمان بے چارہ جو قرآن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ خالقِ کائنات کی براہِ راست کتاب یقین کرتا ہے کیا اس نزولی ترتیب کی جستجو کی تلاش میں پاپڑ بیلنے کے بعد اللہ میاں کی پاکیزہ روح کی ''کمزوریوں اور ناگزیر نیرنگیوں'' کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے؟ یا نزولی ترتیب کی جستجو کی

(۱) لین پول خطبات واحادیث رسول، ص:۱۰

دعوت دینے والے کیا اپنے پیدا کرنے والے مالک کی ان ہی مذبوحی حرکات کا تماشا خود بھی اور مسلمانوں کو بھی دکھانا چاہتے ہیں؟

میں نے جیسا عرض کیا، انسانی تصنیفوں کے متعلق بھی جب اس قسم کی کرپڑگیوں کا مالیخولیا دماغوں میں پیدا نہیں ہوتا تو العیاذ باللہ حق سُبحانہ تعالیٰ کی کتاب کے متعلق اس سوال کے اٹھانے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں؟ اور کوئی چاہے بھی تو میں نہیں سمجھتا کہ انسانی تصانیف کے متعلق بھی ان باتوں کا پتہ چلانا آسان ہے مصنف کو اپنی اس کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں کن مرحلوں سے گزرنا پڑا، یادداشتوں میں کون سی یادداشت پہلے نوٹ ہوئی اور کونسی بعد میں یا کتاب کا کونسا حصہ پہلے مکمل ہوا، اور کون سا بعد میں قرآن کے ساتھ مسلمانوں کی غیر معمولی دلچسپیوں سے جہاں بہت سی عجیب وغریب چیزیں قرآن کے متعلق پیدا ہوگئی ہیں، مثلاً اس کتاب کے ایک ایک حرف اور حروف کے اعراب یعنی زیر وزبر، پیش سب ہی کو ثواب کا کام سمجھ کر گن لیا گیا ہے اور جو کچھ اس سلسلے میں تیرہ سو برسوں کی طویل مدت میں مسلمان کرتے چلے آئے ہیں ایک مستقل کتاب کا وہ مضمون ہے۔ غیر معمولی دلچسپیوں کے اسی ذیل میں تمام کتابوں کے مقابلہ میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے کُل تو نہیں لیکن معقول اور معتد بہ حصے کے متعلق مسلمانوں میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں جن سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی کونسی سورۃ کس مقام میں اُتری یعنی مکہ میں یا مدینہ میں، اسی طرح انہی روایتوں میں اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ فلاں آیت یا آیتوں کا مجموعہ فلاں مشہور واقعہ کے وقت اترا شانِ نزول کی اصطلاح ان ہی معلومات کے متعلق مسلمانوں میں مروج ہے۔

بہرحال اتنی بات درست ہے کہ ان روایتوں کی مدد سے سورتوں کی کافی تعداد

کے متعلق اس کا پتہ چلالیا گیا ہے کہ وہ مکہ میں اُتری تھیں یا مدینہ میں اور تھوڑی بہت آیتوں کے متعلق بھی کوئی چاہے تو اس قسم کی معلومات فراہم کرسکتا ہے لیکن ان ساری معلومات کے بعد بھی مسلمانوں نے نہیں بلکہ یورپ کے ان ہی پادریوں نے جو آج کل استشراق کے نقاب چہروں پر پردہ ڈال کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ بجائے دینی اور مذہبی عصبیت کے ان کے کاروبار کا تعلق صرف علمی تحقیقات سے ہے ان ہی مستشرقین کا یہی طبقہ دوڈھائی سو سال کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ:۔

''صحیح ترتیب نزول کا معلوم کرنا ناممکن ہے۔'' (نولڈیکی)

ہرش فیلڈ جو اسی فیلڈ کا مشہور سپاہی ہے اس بے چارے کو بھی اسی اعتراف پر مجبور ہونا پڑا کہ:۔

''میں پہلے ہی سے اس کا اقرار کیوں نہ کرلوں کہ اس سلسلہ میں (نزولی ترتیب کی جاسوسی میں) قابلِ اعتماد نتائج حاصل کرنے کی بہت ہی کم امید ہے۔''

(یہ فقرے پروفیسر اجمل کی کتاب سے لیے گئے ہیں جو اسی مسئلہ پر انہوں نے لکھی ہے)

اور یہ حال تو اس وقت ہے جب قرآن کی موجودہ متواتر وقطعی مسلمہ ترتیب میں ترمیم کی اجازت ان روایتوں کی بنیاد پر دیدی جائے جو شانِ نزول کے سلسلہ میں ہماری کتابوں کے اندر پائی جاتی ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ روایات کا جو ذخیرہ ہمارے یہاں پایا جاتا ہے اس ذخیرے میں سب سے زیادہ کمزور اور حد سے زیادہ ضعف ان روایتوں کی خصوصیت ہے جن کا تعلق قرآن کی تفسیر وغیرہ سے ہے، امام احمد بن حنبلؒ کا تو اس سلسلہ میں یہ مشہور قول ہے کہ ''**ثلاثة ليس لها اصل التفسير والملاحم**

والمغازی.''(۱) یعنی روایات کا جو ذخیرہ حدیث کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اس میں ایسی روایتیں جن کا تعلق تفسیر یا ملاحم (آئندہ پیش آنے والی جنگوں کی پیش گوئیاں) یا مغازی (عہدِ نبوت کی جنگی مہموں کے قصے) امام احمدؒ فرماتے تھے کہ ان تینوں قسم کی روایتوں کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے۔ سیوطیؒ نے اس قول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سب کو بے اصل قرار دیا تو مشکل ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کا اعتراف خود سیوطیؒ نے بھی کیا ہے کہ قابلِ اعتماد روایتیں تفسیر کے سلسلہ میں ''**قليل جدا**'' اور یہ ''**في غاية القلة**.''(۲)

محدثین کا اس پر اتفاق ہے، تواتر و توارث کے نیّرِ تاباں کی روشنی میں مذہباً نہ سہی عقلاً ہی سہی میں پوچھتا ہوں کہ جگنو کے دُم کی روشنی سے کیا مغلوب ہوسکتی ہے جن چیزوں کو آفتاب کی روشنی میں ہم دیکھ رہے ہیں اور جو معلومات اس روشنی میں حاصل ہوئی ہیں، کیا ان معلومات میں ترمیم کی جسارت ان چیزوں کی مدد سے کوئی کرسکتا ہے جن پر گھپ اندھیری رات میں جگنوؤں کی دُم کی روشنی میں اتفاقاً کسی کی نظر پڑ گئی یقین کیجیے کہ قرآن کی موجودہ مرتب شکل کے متعلق ہمارے علم کی عقلی کیفیت، نزولی روایات کے مقابلہ میں یہی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔(۳)

---

(۱) اتقان جلد:۲،ص:۱۷۸

(۲) جلال الدین سیوطیؒ کے اصل الفاظ یہ ہیں ''**قلت الذى صح من ذلك قليل جداً بل أصل المرفوع منه في غاية القلة**''. (اتقان، ج:۲،ص:۱۷۹)

(۳) نزولی روایات کی حیثیت اور سنداً ان کا دوسری اسلامی روایات کے مقابلہ میں کیا درجہ ہے ایک مستقل مضمون ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ اس سلسلہ کا یہ ہے کہ کسی آیت یا آیتوں کے کسی مجموعہ کے متعلق ''صحابی'' یا تابعی جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں نازل ہوئی یعنی ''**نزل في كذا**'' کہتے ہیں تو اسکا واقعی مطلب کیا ہوتا ہے؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ زرکشی صاحب ''**البرهان**''، حضرت (جاری ہے)

= شاہ ولی صاحب اور دوسرے اکابر ائمہ اسلام نے تصریح کی ہے کہ جس معاملہ میں یا جس واقعہ پر قرآن کی وہ آیت صادق آتی ہے تو اس کے متعلق تعبیر کا یہ ایک طریقہ تھا یعنی یہ آیت فلاں چیز پر صادق آتی ہے اسی مفہوم کو "نزل فی کذا" کے الفاظ سے لوگ ادا کرتے تھے۔
قیامت تک پیش آنے والے واقعات پر قرآنی آیتیں عموماً صادق آتی ہیں اس لیے ہم ہر زمانے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ یا واقعہ یا مسئلہ کے متعلق نازل ہوئی لیکن اس کا یہ مطلب کہ واقعۃً اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی صحیح نہ ہوگا دیکھو اتقان (نوع:۹، ج:۱،ص:۳۱) شاہ ولی اللہ نے "الفوز الکبیر" (۱) میں بھی یہی لکھا ہے، ابن تیمیہ اور زرکشی (۲) کے اقوال اتقان میں ہیں۔ علاوہ اس کے کون نہیں جانتا کہ نزولی روایتوں سے بخاری و مسلم بلکہ صحاح ستہ کی اکثر کتابیں خالی ہیں، دوسرے بلکہ زیادہ تر تیسرے درجہ کی کتابوں میں یہ روایتیں ملتی ہیں اور اس پر بھی حال ان روایتوں کا یہ ہے کہ ایک ایک آیت کے متعلق شان نزول کی روایتوں میں متعدد واقعے بیان کیے گئے ہیں ان روایتوں کی کیا حالت ہے ان کا سرسری اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ اور تو اور یہ مسئلہ کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی آیت تک کے متعلق ایک سے زائد روایتیں پائی جاتی ہیں عام طور پر اقراء کے متعلق مشہور ہے لیکن نزولی روایات کے ذخیرہ میں دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بعض لوگ سورۂ فاتحہ کو، بعض لوگ سورۂ الفلق کو سب سے پہلی نازل ہونے والی سورۃ قرار دیتے ہیں اسی طرح کہاں نازل ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں آپ کو سورۂ فاتحہ تک کے متعلق معلوم ہوگا کہ بجائے مکہ کے کہتے ہیں مدینہ میں نازل ہوئی اور یہ تو عام بات ہے کہ ایک ہی آیت کے متعلق پانچ پانچ چھ چھ شان نزول تک مروی ہے۔ ابن قیم نے محدثین کے اسی طرز عمل پر کہ ان ہی نزولی روایتوں کی وجہ سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آیت پانچ دفعہ مثلاً نازل ہوئی سخت تنقید کی ہے۔۱۲۔ (مناظر احسن گیلانی)

(۱) ملاحظہ ہو "الفوز الکبیر" ص:۲۷۔ عبدالحلیم

(۲) علامہ زرکشیؒ کی کتاب "البرہان" چھپ گئی ہے جو جلال الدین سیوطیؒ کے پیش نظر ہے، ملاحظہ ہو "البرہان فی علوم القرآن" (ج:۱،ص:۳۱،۳۲) عبدالحلیم

نزولی ترتیب کا ایک تاریخی لطیفہ:

اسی نزول ترتیب کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ وہ بھی ہے جسے منسوب کرنے والوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کر کے کچھ اس طرح اسے مشہور کر دیا ہے کہ عوام میں گویا یہ مان لیا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نزولی ترتیب پر قرآن مرتب کر کے ایک نسخہ واقعہ میں تیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر صرف یہی ہے کہ جلد بندی میں سورتوں کی یعنی ان قرآنی رسالوں کی جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے یعنی پہلے سورۂ فاتحہ پھر البقرہ پھر آل عمران سے آخر الناس تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نسخہ میں سورتوں کی ترتیب یہ نہ تھی تو میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کسی ایک مصنف کی چند کتابوں مثلاً سعدی کی گلستاں و بوستاں کی جلد بندی میں آپ خواہ بوستاں کو پہلے رکھوایئے یا گلستاں کو ان دونوں کتابوں کے مضامین پر کوئی اثر اس کا نہیں پڑتا اور ابھی آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض دوسرے صحابہ کے قرآنی نسخوں کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ ان میں بھی سورتوں کی ترتیب وہ نہ تھی جو اس وقت پائی جاتی ہے۔

لیکن اس نزولی ترتیب کا مطلب اگر یہ ہے کہ ہر ہر سورہ میں آیتوں کے اندر جو ترتیب اس وقت پائی جاتی ہے، حضرت علی والے مرتبہ نسخے میں بجائے اس ترتیب کے کوئی اور ترتیب آیتوں میں دی گئی تھی تو اس کا مطلب اور نتیجہ کیا ہوسکتا ہے؟ اس کی دلچسپ داستان تو ابھی آپ کو معلوم ہوگی لیکن چونکہ حضرت علی کی طرف اس روایت کو منسوب کر کے مختلف قسم کی غلطیاں پھیلانے والے پھیلا رہے ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود

اس روایت کی جو واقعی حیثیت اور کیفیت ہے پہلے اس سے مسلمانوں کو مطلع کر دیا جائے۔

بقول مولانا گیلانیؔ واقعہ صرف یہ ہے کہ روایات اور حدیثوں کی موجودہ عام کتابوں مثلاً بخاریؔ و مسلمؔ اور ان کے سوا صحاح کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ حدیث کی ان کتابوں میں ہی نہیں بلکہ جن کتابوں کو حدیث کی کتابیں کہتے ہیں خواہ سنداً ان کا مقام کتنا ہی گرا ہوا ہو ان میں بھی یہ روایت نہیں ملتی، چند غیر معروف کتابیں جن کا ذکر سیوطیؔ نے ''اتقان'' (ج:۱،ص:۵۷) میں کیا ہے ان کے سوا سند کے ساتھ صرف ابن سعد کی کتاب ''طبقات'' (ج:۲،ص:۳۳۸) میں اس وقت تک مجھے یہ روایت ملی ہے۔ کنز العمال (ج:۲،ص:۵۲) میں بھی اس روایت کو نقل کر کے صرف ابن سعد ہی کا حوالہ دیا ہے جس میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ صاحب کنز العمال بلکہ جلال الدین سیوطیؔ نے رطب و یابس روایتوں کی محیط (انسائیکلوپیڈیا) جب تیار کرنی چاہی تو ان دونوں بزرگوں کو بھی غالباً ابن سعد کے طبقات کے سوا کسی ایسی کتاب میں یہ اثر نہیں ملا جسے وہ لائق ذکر خیال کرتے، بہرحال ابن سعد نے جن الفاظ میں اس روایت کو درج کیا ہے ان کو پڑھ لیجئے جو یہ ہیں:۔

''عن محمد قال نبئت ان علیا ابطأ عن بیعة ابی بکر فلقیه ابوبکر فقال اکرهت امارتی فقال لا ولکنی آلیت بیمین ان لا ارتدی بردائی الا الی الصلاة حتی اجمع القران.''

ترجمہ: ''محمد (ابن سیرین) سے یہ روایت ہے کہ وہ کہتے تھے مجھے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں کچھ تاخیر ہوئی تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

ملے اور پوچھا کہ میری امارت (یعنی خلافت) کو تم نے ناپسند کیا۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا کہ نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ میں نے یہ قسم کھائی تھی کہ نماز کے سوا اپنی چادر (جسے اوڑھ کر باہر نکلتے تھے اُسے) نہ اوڑھوں گا جب تک کہ قرآن کو جمع نہ کرلوں۔''

اصل روایت تو اسی پر ختم ہوتی ہے، آگے محمد یعنی ابن سیرین نے آخر میں اتنا اضافہ اور کیا کہ:۔

''فزعموا أنه كتبه على تنزيله.'' (ابن سعد ج:۲،ص:۳۳۸)

ترجمہ: ''لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت علی نے تنزیل پر اس قرآن کو لکھا تھا۔''

بس یہ سارا فتنہ قرآن کی نزول ترتیب کا ابن سیرین کے ان ہی الفاظ ''کتبه علی تنزیله'' کو بنیاد بنا کر اُٹھایا گیا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ بعض روایتوں میں اپنے خود تراشیدہ مطالب بھر کر ان سے لوگوں نے ناجائز نفع اٹھایا ہے، ان میں ایک روایت یہ بھی ہے، علامہ شہاب محمود آلوسی نے اپنی تفسیر ''روح المعانی'' کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اسی روایت کو چنگاری بنا کر فتنے کی آگ جن لوگوں نے پھیلائی ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت ''ابوحیان توحیدی'' کی ہے (دیکھئے مقدمہ روح المعانی،ص:۲۲، ج:۱) یہ ابوحیان توحیدی کون تھا اور زندگی بھر کیا کرتا رہا اس کا قصہ تاریخوں میں پڑھیے۔(۱)

(۱) ابوحیان توحیدی کے کچھ حالات لسان المیزان میں حافظ ابن حجرؒ نے بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ چوتھی صدی کا آدمی ہے، اس عہد کے دو مشہور وزیر صاحب بن عباد اور ابن عمید کے درباریوں میں تھا۔ علم کو دنیا طلبی کا ذریعہ ان ہی وزراء کے دربار میں گھس کر بنانا چاہا جیسا کہ اسی کا بیان ہے اس مقصد میں کامیابی اس کو نہ ہوئی تو بقول اکبر مرحوم: ﴿ہو گیا فیل امتحانوں میں ☆ اب ارادہ ہے بدمعاشی کا﴾ ابوحیان بھی فتنہ انگیزی کے منحوس مشغلہ میں مصروف ہوگیا۔ نہ آدمی قابل تھا (جاری ہے)

بہرحال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سورتوں کی ترتیب کا ذکر اگر اس روایت میں ہے اور روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں یقیناً اس کی بھی گنجائش ہے تو اس وقت تو خیر کوئی بات ہی نہیں ہے اب بھی مسلمان بچوں کے پڑھانے کے لیے "عَمَّ" کے پارے کی سورتوں کی ترتیب بدل دیتے ہیں یعنی پہلے 'والناس' پھر 'الفلق' اور آخر میں سورہ "عَمَّ

= اور فلاسفہ کا ادیب اور ادیبوں کا فلسفی تھا۔ مقامات حریری کے سروجی کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا اسی لیے بعض لوگوں انے اس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صوفیوں کا شیخ، فلاسفہ کا ادیب اور ادیبوں کا فلسفی تھا۔ یعنی فلسفہ والوں کے سامنے ادیب بنتا تھا اور ادیبوں کے سامنے فلسفی اور جیسے ابن راوندی کرایہ پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی طرف سے کتابیں لکھا کرتا تھا، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہی پیشہ تنگ آکر اس فیلسوف الادباء اور ادیب الفلاسفہ نے اختیار کر لیا تھا۔ جعلی کتابوں کے بنانے میں کمال تھا، لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر کے نام سے ایک طویل خط اس نے تصنیف کیا اور ظاہر یہ کیا کہ حضرت علی نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے جب انکار کیا تو دونوں ابوبکر و عمر نے مل کر یہ خط حضرت علی کو لکھا تھا۔ اس خط میں کہیں تو خوشامد کی باتیں تھیں اور کہیں دھمکیاں حضرت علی کو دیگئی تھیں، الغرض اس جعلی خط کو لکھ کر مسلمانوں میں اس نے پھیلا دیا جب فتنہ زیادہ بڑھا تو بعض لوگوں نے اس سے دریافت کیا، ایک دن راز کھول دیا کہ شیعوں کے خلاف خود ہی میں نے یہ جعلی خط بنایا ہے، حالانکہ شیعوں سے زیادہ اس میں سنیوں کے خلاف مواد تھا، ایسی باتیں ابوبکر و عمر کی طرف منسوب کی گئی تھیں جو کسی معمولی مسلمان کی طرف بھی کاربرآری کے سلسلہ میں منسوب نہیں ہوسکتیں۔ اس سلسلے میں ان حضرت کے اور کارنامے بھی ہیں۔ اسی بناء پر علماء حق نے اس کے متعلق اس فیصلہ کا اپنی کتابوں میں اعلان کیا کہ یہ بڑا جھوٹا مفتری دین سے مفلس، علانیہ بیہودہ بکواس کرنے والا اور جن باتوں سے دینی نظام پر زد پڑتی ہو ان کے پھیلانے میں کمال رکھتا تھا، حافظ ابن حجر نے ابن مالی کی کتاب "الفریدہ" سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ ابن جوزی نے بھی لکھا ہے کہ "ابوحیان زندیق تھا، اس کی انہی عبارتوں کی وجہ سے مہلبی وزیر نے اس کو جلاوطن کر دیا تھا۔ اصلی نام علی بن محمد تھا، لکھا ہے کہ جب مرنے لگا تو اس کے شاگرد جو بستر علالت کے اردگرد جمع تھے اور اس کی زندگی کی خصوصیتوں سے واقف تھے، گھبرا کر بے چاروں نے اللہ اللہ کی تلقین شروع کی، اور توبہ و (جاری ہے)

یَتَسَآئَلُوْنَ" ان پاروں میں چھاپی جاتی ہے۔

چونکہ ہر سورۃ اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے اس لیے ترتیب کی اس تبدیلی کا کوئی اثر معانی و مطالب پر نہیں پڑتا، اور مقصد اگر سورتوں کی آیتوں کی اُلٹ پھیر کا ہے، غالباً فتنہ پردازوں کی بُری نیت بھی یہی ہے، ورنہ سورتوں کی نزولی ترتیب کے مسئلہ کو اتنی اہمیت کیوں دیتے تو قطع نظر اس سے کہ بجائے سورتوں کے یہ دعویٰ کرنے والوں کے ذمہ ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس دعوے کے ثبوت کے لیے وہ کوئی قرینہ پیش نہیں کر سکتے مگر بہرحال مان لیا جائے کہ ان الفاظ کا وہی مطلب ہے جو خوامخواہ بلاوجہ زبردستی ان الفاظ سے نکالنا چاہتے ہیں تو اب آیئے اور دیکھیے کہ سنداً اس روایت کا کیا حال ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ محمد یعنی ابن سیرین روایت کی ابتداء کرتے ہوئے "نبئت" لفظ بولتے ہیں، یعنی کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع دی گئی لیکن کس نے اطلاع دی اس اطلاع دینے والے کا نام نہیں بتاتے، لیجیے راوی مجہول ہو گیا، اور ایسی روایت جس کے راوی کا حال تو حال نام تک معلوم نہ ہو، خود

= استغفار کے لیے اس کو ہدایت کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ ابوحیان نے آنکھیں کھولیں، اور سر اٹھا کر بولا کہ کیا میں کسی فوجی سپاہی یا پولیس کے پاس جا رہا ہوں، پھر کہا "رب غفور" کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اسی آخری فقرے پر دم نکل گیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ دراصل اس کے مزاج میں شوخی اور گستاخی تھی۔ ادب سے محروم تھا۔ صاحب بن عباد اور اب العمید کے دربار میں جب توقعات رکھتا تھا تو لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان کی تعریف میں مبالغہ کرتے ہوئے یہ تک اس نے لکھ مارا کہ یہ دونوں اگر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھیں تو ان پر وحی نازل ہونے لگے اور شریعت نئی ہو جائے مسلمانوں کے دینی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔ متعدد جعلی حدیثوں کے مشہور کرنے میں اس نے خاصی شہرت حاصل کی ،جن میں حضرت علی والی یہ روایت بھی ہے یعنی قرآن کی نزولی ترتیب کی وجہ سے بیعت سے رکے رہے۔
(دیکھو لسان المیزان ج:۷، ص:۳۸ تا ۴۱) مناظر احسن گیلانی۔

سوچیے کہ اس کی قیمت کیا باقی رہی، یہ حال تو اصل روایت کا ہے، پھر روایت کو ختم کر کے مزید اضافہ آخر میں ابن سیرین نے اپنی طرف سے جو کیا ہے اور اسی اضافہ میں ترتیب کی تبدیلی کا ذکر ہے۔ اس اضافہ کو بھی "زعموا" کے لفظ سے ادا کرتے ہیں جس کا عام ترجمہ اُردو میں یہ کیا جاسکتا ہے یعنی "خیال کرتے ہیں" پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ خیال کرنے والے کون لوگ ہیں؟ ابن سیرین یہ بھی نہیں بتاتے، جس سے پتہ چل سکتا تھا کہ وہ کس قسم کے لوگ تھے، نیز "زعموا" کا لفظ عربی زبان کے لفظ "زعم" سے بنا ہے، 'زعم' کا یہ لفظ بجائے خود اپنے اندر حد سے زیادہ کمزوری کو چھپائے ہوئے ہے۔ بعض بزرگوں کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے لڑکوں سے انہوں نے کہا تھا کہ "زعموا" کا لفظ مجھے بخش دو، یعنی کبھی استعمال نہ کرنا، حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ جھوٹ کو چلتا کرنے کے لئے "زعموا" کا لفظ بہت اچھی سواری کا کام دیتا ہے جیسے اس زمانے کی اخبار نویسی میں "سمجھا جاتا ہے۔" "قیاس کیا جاتا ہے۔" "معتبر حلقوں سے یہ بات پھیلی ہے۔" یہ یا اسی قسم کے فقرے دراصل جھوٹ کو آگے بڑھانے کی عصری سواریاں ہیں۔ حافظ ابن حجر نے انقطاع کا نقص بتاتے ہوئے اس روایت کو سنداً مسترد کر دیا ہے (دیکھو اتقان ج:۱، ص:۵۷) اور خواہ مخواہ مان بھی لیا جائے کہ روایت کلیۃً بے اصل نہیں ہے جب بھی عرض کر چکا ہوں کہ "نزولی ترتیب" ایسی تعبیر ہے جس میں سورتوں اور آیتوں دونوں کی ترتیب کا احتمال ہے، لیکن مدعا مدعیوں کا جب ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ذریعہ سے یہ ثابت کریں کہ سورتوں کی ترتیب نہیں بلکہ ہر سورۃ کی آیتوں کی موجودہ ترتیب کی جگہ نزولی ترتیب حضرت والا نے دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس احتمال کے معین کرنے کی قطعاً کوئی صورت نہیں ہے علاوہ اس کے علماء نے لکھا ہے کہ بعض روایتوں سے جو معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ ومنسوخ آیتوں کو ایک ہی جگہ مرتب کر کے

حضرت علی نے ایک کتاب لکھی تھی اور اسی کی طرف یہ اشارہ ہے تو بقول آلوسی پھر یہ قرآن کا نسخہ ہی کب باقی رہا، یہ تو "ناسخ ومنسوخ" کی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہوگئی اور بیسیوں احتمالات ہیں، کہنا یہی ہے کہ لے دے کے اسی ایک ٹوٹی پھوٹی شکستہ وبرشتہ روایت کو بنیاد بنا کر یقین کی اس قوت کو مضمحل کرنے کی کوشش کرنا جو قرآن کی موجودہ متواتر ومتوارث ترتیب کے متعلق انسانی فطرت رکھتی ہے بجز مغالطہ بازی کے اور کیا ہے۔(۱)

---

(۱) اتقان میں سیوطی نے جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ بعض غیر مشہور کتابوں کا حوالہ دے کر بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے مثلاً ابن الفریس کی کتاب "الفضائل" کی طرف منسوب کر کے ابن سیرین ہی کی اس روایت کو درج کرتے ہوئے نئی بات کا اضافہ یہ کیا ہے کہ ابن سیرین سے عکرمہ (مولیٰ ابن عباسؓ) نے اس قصہ کا ذکر کیا تھا اس پر ابن سیرین نے عکرمہ سے دریافت کیا کہ حضرت علی کے قرآن جمع کرنے کا مطلب کیا تھا کہ "کما انزل الاول فالاول" یعنی جو پہلے نازل ہوئی اس کو پہلے پھر اس کے بعد جو نازل ہوئی اس کو بعد، بالفاظ دیگر ابن سیرین نے یہ سوال کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نزولی ترتیب پر جمع کیا تھا؟ اس روایت میں ہے کہ جواب میں عکرمہ نے کہا کہ "جن وانس بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ قرآن کو اس ترتیب پر مرتب کریں تو یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔" عکرمہ کے عربی الفاظ یہ ہیں۔ "لو اجتمعت الانس والجن علی ان یؤلفوہ ذلک التالیف مااستطاعوا" اسی طرح ابن اشتہ کی کتاب "المصاحف" سے سیوطی نے نقل کیا ہے کہ ابن سیرین کہا کرتے تھے کہ حضرت علی والے مرتبہ قرآن کے متعلق مدینہ کے لوگوں کو لکھا اور بہت تلاش کیا لیکن مجھے نہ مل سکا۔ اور یہ خبر بھی اس روایت کے جعلی ہونے کی دلیل ہے۔ آخر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ مرتبہ نسخہ اور کسی کے پاس نہ سہی خاندان اہل بیت میں اس کے نہ ملنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے بلکہ بقول ابن حزم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی خلافت کے زمانہ میں پانچ (۵) سال نو مہینہ کی مدت ملی، چاہتے تو اپنی حکومت کے ان دنوں میں اپنے مرتبہ نسخوں کو مسلمانوں میں پھیلا دیتے۔۱۲۔

نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا:

ماسوا اس کے سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ بقول مولانا گیلانی یہ ہے کہ نزولی ترتیب کے ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے کبھی اس پر غور کیا کہ خدانخواستہ اسی ترتیب پر ہر ہر سورۃ کی آیتوں کو مرتب کرنے کی کوشش میں اگر کوئی کامیاب ہو بھی جائے۔ جس طرح وہ نازل ہوتی رہی ہیں تو آیتوں میں اس تاریخی ترتیب کے پیدا کرنے کی سعی لا حاصل کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کو سوچنے کے لیے مَیں آپ کی توجہ پھر ادھر منعطف کرانا چاہتا ہوں جس کا ذکر شروع مضمون میں بھی اجمالاً آ چکا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنی سورتوں کی حیثیت کسی واحد بسیط کتاب کی نہیں ہے بلکہ ہر ہر سورۃ کا موضوع اور اس کی غرض وغایت دوسری سورہ کے مقابلے میں مستقل حیثیت رکھتی ہے علاوہ اس کے کہ تجربہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ سورتوں کے مضامین کی اسی استقلالی حیثیت کے احساس ہی کا نتیجہ عہدِ صحابہ میں یہ تھا کہ صرف دو سورتیں یعنی ''سورۂ انفال اور سورۂ برأت'' کے مضامین میں تھوڑا بہت وحدت کا رنگ جو پایا جاتا تھا لیکن پھر بھی دونوں کی حیثیت چونکہ بالکلیہ ایک نہ تھی، آپ جانتے ہیں کہ امتیاز کے اسی رنگ کو باقی رکھنے کے لیے کیا کیا گیا؟ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہر سورۃ دوسری سورۃ سے ''بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' کے فقرہ سے جدا کی گئی ہے، لیکن ان دونوں سورتوں کے بیچ میں ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' نہیں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ تو آپ نے فرمایا کہ:۔

''كانت قصتها شبيهة بقصتها فظننت انها منها فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يبين لنا انها منها فمن اجل ذلك قرنت بينهما ولم اكتب بينهما

''بسم الله الرحمن الرحيم.''

(ابوداؤد، ج:۱،ص:۳۵۰،وترمذی،ج:۵،ص:۱۶۶،از جمع الفوائد، ج:۳،ص:۱۳۵)

ترجمہ: ''یعنی دونوں سورتوں کے مضامین ملتے جلتے تھے اس لیے ہم نے خیال کیا کہ یہ (برأت) بھی اسی میں سے ہے (یعنی انفال ہی میں داخل ہے) اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی مگر آپ سے یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ واقعی برأت انفال میں سے ہے اس لیے دونوں کو ہم نے جوڑ تو دیا لیکن ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' ان دونوں کے بیچ میں نہ لکھا۔''

آپ دیکھ رہے ہیں سورتوں کے مضامین کے مسئلہ میں صحابہ کے احساس کی اس غیر معمولی نزاکت کو؟ سورتوں کی وحدت اور تعدد کا مدار مضامین کی وحدت اور تعدد پر ہے۔ صحابہ کا جو نقطۂ نظر اس باب میں تھا کیا اس کے لیے اس سے زیادہ واضح شہادت کی ضرورت ہے، بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ دیکھنے میں قرآن کی سورہ کتنی بھی چھوٹی نظر آتی ہو جیسے ہاتھی کے مقابلہ میں چیونٹی، لیکن ایک مستقل جسمانی نظام کی بہرحال چیونٹی بھی مالک ہے۔ یہی حال ہر سورہ کا ہے۔ (۱) اور کہا جا سکتا ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ موضوع اور

---

(۱) مثلاً سورۂ ''قُلۡ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ'' یا الکوثر یا العصر ہی کو لیجئے تین چار آیتوں سے زیادہ ان میں کوئی سورہ نہیں ہے لیکن جن حقائق اور معانی سے ان میں کی ہر ایک لبریز ہے اور انسانی (جاری ہے)

غرض وغایت کے لحاظ سے جیسے جغرافیہ کا علم طب سے اور طب کا تاریخ سے، تاریخ کا علم کیمسٹری سے اپنی الگ مستقل حیثیت رکھتا ہے، یہی اور بجنسہٖ یہی حال قرآن کی ہر سورہ کا دوسری سورہ کے مقابلہ میں ہے۔

اب ذرا خیال کیجئے کہ نزولی ترتیب پر ہر ہر سورہ کی آیتوں کو مرتب کرنے کے معنی کیا ہوں گے۔ مذکورہ بالا مختلف علوم وفنون مثلاً طب، جغرافیہ اکانومی، کیمسٹری اکانومی وغیرہ کی کتابیں جن کا مصنف فرض کیجئے ایک ہی شخص ہو اور ان ساری کتابوں کو آگے پیچھے شروع کر کے اس نے خاص مدت میں ختم کی ہوں اب اگر اسی مصنف کی ان تمام قدیم یادداشتوں کے تلاش کرنے میں کوئی کامیاب بھی ہو جائے جنہیں مختلف علوم وفنون کی ان کتابوں کی تالیف وتصنیف کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً مصنف جمع کرتا رہا اور ان ہی کی مدد سے ہر کتاب کو اس نے مکمل کیا تھا۔ پھر ان تمام یادداشتوں میں تاریخی تراتیب پیدا کر کے سب کو مرتب کر کے کسی کتاب کی شکل میں کوئی اگر پیش کرے تو صورت اس کتاب کی کیا ہو جائے گی؟ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے اگر آپ کو اس کتاب کی ابتدائی چند سطروں میں تو طب کے کچھ نسخے اور مسائل ملیں اور ان ہی کے بعد فقروں میں جغرافیہ کی معلومات ان کے بعد کیمسٹری کے نظریات، علیٰ ہٰذا القیاس چوں چوں کا مربہ کوئی واقعہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ کتاب تو یقیناً چوں چوں کا مربہ ادیوانی ہنڈیا بن کر رہ جائے گی۔

بہرحال قرآن کی موجودہ ترتیبی شکل تو اتر اور توارث کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے ایک ایسی قطعی حقیقت کے متعلق نزولی ترتیب والی ایسی روایتوں کی مدد سے ترمیم پر آمادہ

= زندگی کے جن خاص شعبوں کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ان سے ہوتے ہیں کسی جاننے والے سے پوچھیے کچھ نہیں تو علامہ فراہی کی تفسیر کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے۔۱۲

ہو جانا جن کی سند کو حدیثوں کی صحت کے مقررہ معیار پر پورا اُترنا آسان نہیں ہے، جنون نہیں تو اور کیا ہے، اتقان (ج:۱ص:۱۰۹) میں سیوطی نے طبرانی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی سند جید ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صحابی سے پوچھا کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ:۔

"یقرء القران منکوسا."

ترجمہ: ''قرآن کو الٹ کر پڑھتا ہے۔''

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی جو عام ترتیب ہے بجائے اس ترتیب کے الٹ کر قرآن کو پڑھتا ہے، لکھا ہے کہ جواب میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:۔

"ذاک منکوس القلب."

ترجمہ: ''وہ اوندھے دل کا آدمی ہے۔''

بتائیے کہ اسی زمانے میں جب اس قسم کے لوگوں کو منکوس القلب کہا گیا تھا تو آج سورتوں ہی کی ترتیب میں تصرف وترمیم کی جرأت کیوں کی جائے، ہم بے جا جرأت کے ان مجرموں کو کیا سمجھیں یا کیا کہیں حالانکہ میں نے جیسا کہ عرض کیا سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے، خود بخاری میں ہے کہ ایک عراقی ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ ذرا اپنا قرآن مجھے دکھایئے تو ام المؤمنین نے فرمایا کہ کس لیے دکھاؤں۔ اس نے کہا کہ آپ کے قرآن کی جو ترتیب ہے یعنی سورتوں کی جو ترتیب ہے اسی ترتیب سے میں بھی اپنے قرآن کی سورتوں کو مرتب کرنا چاہتا ہوں، ام المؤمنین نے اس وقت جواب میں فرمایا کہ:۔

"مایضرک أَیَّهُ قَرَأْتَ." (بخاری ج:۲،ص:۷۴۷)

ترجمہ: ''کسی طرح پڑھو تم کو اس سے نقصان نہ پہنچے گا۔''

میں نے پہلے بھی کہیں کہا ہے کہ بچوں کے لئے عم کا پارہ سہولت کے لیے آج بھی اس ترتیب پر نہیں چھپتا جس ترتیب پر قرآن میں یہ سورتیں ہیں اور یہ وہی بات ہے کہ ایک ہی مصنف کی چند کتابوں کو آپ جس ترتیب سے چاہیں جلد بندی کرا سکتے ہیں کتاب کے معانی و مطالب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پس اصل مسئلہ ہر ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب کا ہے اس مسئلہ میں جیسا کہ سیوطی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اول سے آخر تک اس پر اتفاق ہے کہ آیتوں کی ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبرئیل علیہ السلام کے حکم سے دی ہوئی ہے اس ترتیب میں کسی قسم کی ترمیم خود قرآن کی ترمیم ہے، سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"ترتیب الایت فی سورها واقع بتوقیفه صلی الله علیه وسلم وأمره من غیر خلاف فی هذا بین المسلمین." (اتقان، نوع:۱۸، ج:۱،ص:۶۰)

ترجمہ: ''ہر ہر سورۃ میں آیتوں کی ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے اور حکم سے دی گئی ہے اس میں مسلمانوں کے اندر کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

اور میری تو سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی کتاب کیا کسی مصنف کی ہوسکتی ہے کہ اس کے فقروں کو تو کسی نے بنایا ہو اور ان فقروں کو جوڑ کر عبارت کسی دوسرے نے بنائی ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے اور میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ عہدِ صدیقی میں سورتوں کی جلد بندی جس ترتیب سے کردی گئی تھی اس کا پابند دوسروں کو نہیں کیا گیا تھا بلکہ جیسے کسی مصنف کی چند کتابوں کو جلد بندھوانے والے جس ترتیب کے ساتھ چاہتے ہیں جلد بندھوا دیتے ہیں، ابتداء میں اسی قسم کی انفرادی آزادی مسلمانوں کو جو تھی اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے بعض صحابیوں کے قرآن کی ترتیب دوسرے صحابی کے نسخے سے کچھ مختلف ہوتی تھی مثلاً غیر معیاری روایتوں میں ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں "نون" کی سورہ "الذاریات" کے بعد، "القیامه" کی سورہ "عم یتسائلون" کے بعد، "النازعات" کی "سورہ الطلاق" کے بعد اور "الفجر" کی سورہ "التحریم" کے بعد۔ اسی طرح ابی بن کعب صحابی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں کہتے ہیں کہ "الکهف اور الحجرات" کی سورتیں "نون" کے بعد، "تبارک" "حجرات" کے بعد، "النازعات" "الواقعه" کے بعد، "الم نشرح" "قل هو الله" کے بعد تھی۔

لیکن عہدِ عثمانی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے مجلد کراتے ہوئے قرآن کی نقلیں حکومت نے مرکزی صوبوں میں تقسیم کر کے یہ حکم مسلمانوں کو جب دیا کہ سورتوں کی ترتیب میں بھی اسی کی پابندی کی جائے اور اس حکم کے بعد دوسری ترتیب سورتوں میں بھی قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی تو اس وقت سے یہ اختلاف بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

باقی یہ سوال کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں جس ترتیب سے سورتوں کی جلد بندی کرائی گئی تھی آیا یہ صحابہ کی رائے سے فیصلہ کیا گیا تھا، یا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یہ ترتیب سورتوں میں قائم کی گئی، کوئی واضح روایت اس باب میں نہیں ملتی لیکن امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"انما ألفوا القران علی ما كانوا يسمعونه من النبی صلی الله علیه وسلم ." (اتقان، ج:۱، ص:۶۲)

ترجمہ: "یعنی اس وقت قرآنی سورتوں میں ترتیب اسی ترتیب کی پیروی میں دی گئی جس ترتیب سے صحابہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتے تھے۔"

امام مالکؒ کی اس تاریخی شہادت کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، جبرئیل علیہ السلام کو اس سے پہلے جو رمضان گزرا تھا، دو دفعہ قرآن آپ نے سنایا تھا۔

یہ روایت بخاری (ج:۱، ص:۳۰) وغیرہ تمام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اس وقت تک بجز چند آیتوں کے قرآن پورا نازل ہو چکا تھا پس جس ترتیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل کو سنایا تھا کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ سورتوں کی جلد بندی میں اس طرزِ عمل کی پیروی نہ کی جاتی پس سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی اس لحاظ سے جبرئیل امین ہی کا توثیق یافتہ ہے اور خدا کا فضل ہے کہ عہدِ عثمانی کے اس فرمان کے بعد جس میں عہدِ صدیقی کے مرتبہ مصحف کی پیروی ہر مسلمان کے لیے لازم کردی گئی۔ اس وقت تک مسلمان مشرق و مغرب میں اول سے آخر تک اسی کے پابند ہیں البتہ ضرورتاً جیسے بچوں کی تعلیم وغیرہ کی سہولت کے لیے کبھی اس آزادی سے بھی نفع اٹھالیا جاتا ہے جو اس فرمان کے نفاذ سے پیشتر صحابہ میں پائی جاتی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں تجویدی خدمات اور

اس کے سمجھنے سمجھانے میں تفسیری کارناموں کے سوا خود قرآن کے لکھنے لکھانے میں بھی مسلمانوں نے جن الوالعزمیوں کا بھی ثبوت دیا ہو عربی غیر عربی ہر قسم کے مسلمانوں کے لیے قرآن کا پڑھنا آسان ہو جائے اس کے لیے انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہو حروف میں غیر معمولی محاسن پیدا کیے گئے، اعراب و زیر و زبر و پیش جزم تشدید وغیرہ جیسی ایجادیں کی گئیں حتیٰ کہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن کو مسلمانوں نے سونے موتی اور مختلف قسم کے جواہر کے سیال محلول سے بھی بکثرت لکھوایا۔ اور کیا کیا بتاؤں کہ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔(۱)

لیکن پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چودہ (۱۴) سال بعد عہدِ عثمانی

(۱) حال ہی میں میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ نظام الملک طوسی سلجوقی دربار کے مشہور وزیر کے پاس ہدیہ میں ایک عالم نے جن کا نام عبدالسلام ابو یوسف تھا، قرآن مجید لکھ کر پیش کیا تھا جس میں یہ صنعت رکھی تھی کہ تین رنگ تو انہوں نے جواہرات کو محلول اور سیال کر کے حاصل کیے اور ایک سیال محلول سونے کا تیار کیا۔ قرآن لکھ کر جب پورا ہو گیا تو سُرخ رنگ سے اختلاف قرأۃ کو ان آیتوں کے نیچے ظاہر کیا تھا جن کی قرأت میں قراء کا اختلاف ہے اسی طرح قرآن کے ایسے الفاظ جن کے معانی عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہیں ان کے معانی کو سبز رنگ والے جوہری محلول سے لکھا تھا اسی طرح نیلم کے سیال محلول سے انہوں نے پورے قرآن پر زیر و زبر و پیش جزم تشدید، مد وغیرہ لگائے تھے اور ایسی تمام آیتیں جن سے عہد و پیمان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہو، یا جن آیتوں سے باہمی خط و کتابت، تبریک و تہنیت یا تقرب و تسلی وغیرہ میں کام لیا جا سکتا ہو، اسی طرح جن آیتوں میں جنت کی بشارت یا جہنم کی دھمکی دی گئی ہے اس قسم کے تمام مقامات پر سونے کے سیال محلول سے پورے قرآن میں نشانات لگائے تھے (دیکھیے الکتانی کی کتاب "التراتيب الادارية" ج:۱، ص:۱۱۲، مطبوعہ مراکش) اس سلسلہ میں مسلمانوں کے غیر معمولی کارناموں کی کوئی چاہے تو ایک ضخیم تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔۱۲۔

میں قرآنی سورتوں کی جس ترتیبی شکل پر اتفاق و اجماع قائم ہوگیا اس کے متعلق یہ خیال کہ اس میں ردوبدل کی کسی حیثیت سے بھی کچھ امکان ہے۔

خیال تو خیال حقیقت یہ ہے کہ کسی زمانہ میں کسی کو کسی قسم کا خطرہ بھی اس وقت تک نہ ہوا تھا جب تک کہ عیسائی پادریوں نے استشراقی کھال اوڑھ کر اغوائی القاء اور وسوسہ اندازیوں کی مہم شروع نہ کی تھی، لیکن:۔

"يَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ." (التوبۃ:۳۲)

المصادر والمراجع

(۱) إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، طبع: سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶ء

(۲) الإتقان في علوم القرآن، جلال الدین سیوطیؒ ۹۱۱ھ، طبع: سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۴ء

(۳) أسد الغابة، ابن الأثیر، مطبوعہ: المکتبۃ الاسلامیۃ، طہران

(۴) إعجاز التنزیل

(۵) البرهان في علوم القرآن، بدرالدین زرکشیؒ، دار إحیاء الکتب العربیۃ عیسیٰ البابی حلبی، ۱۹۵۷ء

(۶) التراتيب الإدارية، عبدالحی کتانیؒ، دار إحیاء التراث العربی، بیروت

(۷) تفسیر درمنثور، جلال الدین سیوطیؒ، طبع: دارالفکر، ۱۹۹۳ء

(۸) تاریخ طبری، محمد بن جریر الطبریؒ المتوفی ۳۱۰ھ، طبع: دارالمعارف مصر ۱۹۶۲ء

(۹) التبيان في مباحث القرآن، صالح الجزائری

(۱۰) تفسیر فتح المنان

(۱۱) تذکرة الحفاظ، علامہ ذہبیؒ المتوفی ۷۴۸ھ

(۱۲) تھذیب تاریخ دمشق الکبیر، طبع: دار إحیاء التراث العربی، طبع: سوم ۱۴۰۷ھ

(۱۳) تقریب التھذیب، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، طبع: دار المعرفة ۱۴۲۲ھ

(۱۴) تدوینِ حدیث، مناظر أحسن گیلانیؒ، عربی ایڈیشن: دار القلم کراچی ۲۰۰۵ء، اردو ایڈیشن: مکتبہ اسحاقیہ کراچی ۲

(۱۵) جمع الفوائد، محمد بن محمد رودانی المتوفی ۱۰۹۴ھ، طبع: دار حزم، بیروت ۱۹۹۸ء

(۱۶) جامع الترمذی، محمد بن عیسیٰ الترمذی المتوفی ۲۷۹ھ، دار الغرب الاسلامی بیروت، طبع: دوم ۱۹۹۸ء

(۱۷) حلیة الأولیاء، أحمد بن عبد اللہ أبو نعیم أصفهانی المتوفی ۴۳۰ھ، مطبعة السعادة مصر ۱۹۳۲ء

(۱۸) روح المعانی، طبع: مکتبہ امدادیہ ملتان

(۱۹) سیرت ابن ھشام، برحاشیہ روض الأنف، سہیلیؒ المتوفی ۵۸۱ھ

(۲۰) سنن أبی داؤد، سلیمان بن أشعث السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ، دار ابن حزم ۱۹۹۷ء

(۲۱) سنن نسائی، أحمد بن شعیب النسائی المتوفی ۳۰۳ھ، طبع: دار الفکر، بیروت طبع دوم: ۲۰۰۱ء

(۲۲) سنن ابن ماجه، محمد بن یزید المتوفی ۲۷۳ھ، طبع: دار الجیل، بیروت ۱۹۹۸ء

(۲۳) سیر أعلام النبلاء، علامہ ذہبیؒ المتوفی ۷۴۸ھ، طبع: مؤسسة الرسالة، طبع ثالث، ۱۹۸۵ء

(۲۴) صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل البخاریؒ، طبع ہند وقدیمی کتب خانہ کراچی

(۲۵) صحیح مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری المتوفی ۲۶۱ھ، طبع: دار المعرفة بیروت، طبع نہم: ۲۰۰۳ء، تحقیق خلیل مامون شیحا

(۲۶) طبقات ابن سعد، محمد بن سعد المتوفی ۲۳۰ھ، دار الصادر بیروت ۱۹۹۷ء، دار الفکر بیروت

(۲۷) العقد الفرید، شہاب الدین أحمد ابن عبد ربہ، مطبعة: مصطفیٰ محمد مصر ۱۹۳۵ء

(۲۸) فتح المنان شرح الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمٰن دارمیؒ المتوفی ۲۵۵ھ، شارح: أبو عاصم نبیل العمری، طبع: دار البشائر الاسلامیة ۱۹۹۹ء

(۲۹) الفوز الکبیر فارسی، شاہ ولی اللہ دہلویؒ المتوفی ۱۱۸۰ھ، مترجم عربی از محمد منیر دمشقی، مطبوع: نور محمد أصح المطابع کارخانہ تجارت کراچی ۱۹۶۰ء

(۳۰) الکاشف عن حقائق السنن شرح مشکوٰة، حسین بن محمد طیبی المتوفی ۷۴۳ھ، طبع: إدارة القرآن، کراچی ۱۴۱۳ھ

(۳۱) کتاب ذکر أخبار أصبهان، حافظ أبو نعیم أصفهانی المتوفی ۴۳۰ھ، طبع: بریل لیڈن ۱۹۳۱ء

(۳۲) گیتا اور قرآن، پنڈت سندر لال جی

(۳۳) لسان المیزان، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ المتوفی ۸۵۲ھ، إدارة القرآن کراچی

(۳۴) لین پول خطبات واحادیث رسول

(۳۵) مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، ملاعلی قاری حنفیؒ طبع حقانیہ ملتان

(۳۶) المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم، محمد فؤاد عبدالباقی، مکتب: نوید اسلام قم المقدسہ ۱۴۲۵ھ

(۳۷) معجم أوسط، سلیمان بن احمد طبرانی، طبع: مکتبۃ المعارف، ریاض ۱۹۹۵ء تحقیق محمود الطحان

(۳۸) مجمع الزوائد، نورالدین ہیثمیؒ المتوفی ۸۰۷ھ

(۳۹) مستدرک حاکمؒ، حاکم محمد بن عبداللہ النیسابوریؒ المتوفی ۴۰۵ھ، دارالمعرفۃ بیروت ۱۹۹۸ء

(۴۰) مسند أحمد، امام احمد بن حنبل الشیبانی المتوفی ۲۴۱ھ، المکتب الاسلامی بیروت

(۴۱) مجمع بحار الأنوار فی غرائب التنزيل ولطائف الأخبار، طاہر پٹنی، مکتبہ دارالایمان مدینہ منورہ ۱۹۹۴ء

(۴۲) منتخب كنز العمال برحاشیہ مسند أحمد، علی متقی بن حسام الدین المتوفی ۹۷۵ھ، المکتب الاسلامی بیروت

(۴۳) ہندوستان کے ازمنہ وسطی کی معاشرت واقتصادی حالت، عبداللہ یوسف علی

(۴۴) ہندی فلسفہ، ڈاکٹر گپتا، دارالترجمہ حیدرآباد

قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر

تدوین قرآن

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ